ضربیں

افسانوں کا مجموعہ

ناشر نقو

Al7-124 This is very Good novel

پہلا ایڈیشن ________ ایک ہزار

مارچ ۱۹۴۳ء

...یدرآباد دکن

Every one should read these

نعمانی This is very good novel عشرین

اپنی تقریر میں مصروف تھے اور نعمانی ایک لاابالی انداز میں چھت کو تک رہا تھا۔

" نعمانی! کیا تم میری تائید نہیں کرتے، کیا یہ ایک دولت مند انسان کی جانب سے سب سے پہلا ایثار نہیں ہے؟"

مولانا نے فرمایا۔

" یہ ایثار تو نہیں ہے مولنا۔ ایثار کی تو یہ تعریف ہے کہ انسان اپنی بے بضاعتی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی خود کی اہم ضروریات کو دوسروں کی آسائش کے خاطر قربان کر دے ——— ارے بھئی تم کل سے کہاں غائب تھے؟" نعمانی نے مجھے دیکھ کر کہا۔

" آداب مولنا (نعمانی سے) نعمانی مجھے تم سے نفرت ہوتی جاتی ہے" میں نے کہا۔

" تم بہت اچھے آدمی ہو اپنے جذبات نفرت صاف ظاہر تو کر دیا کرتے ہو، نفرت و رغبت دراصل دونوں غیر حقیقی جذبات ہیں۔ تم ابھی مجھ سے نفرت کرتے ہو لیکن اگر میں اپنے اندر (تمہارے حسب دلخواہ) رغبت انگیز خصوصیات پیدا کر لوں تو تم ہی مجھ سے پھر رغبت کرنے لگو گے، بہر نوع تمہارے درک و احساس دونوں اس باب میں میرے مطیع ہیں، جب تم اپنے مشاعرو احساس تک میں آزاد نہیں ہو تو کس طرح مجھ پر اپنا تفوق ظاہر کرنے کی جرأت کرتے ہو ——— یاد رکھو انسان ایک بہت ہی محتاج و مجبور ذات کا نام ہے، جو خود مختارانہ طور پر یہاں اپنے کسی فعل میں آزاد نہیں۔ تمہارے

تمام اعمال و افعال، کردار و سیرت، شمائل و احساسات سب مستعار ہیں؛ انسان انسان کو دیکھ کر انسان بنتا ہے۔ تنہا اپنی ذات میں وہ کچھ نہیں کرسکتا ———"

"اچھا میاں نعمانی ———" مولانا نے کھڑے ہوتے ہوئے فرمایا۔

"ہاں مولانا آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ خدا حافظ! اچھا تو جناب قدیر صاحب ——— کیا کہہ رہا تھا میں؟"

"لاحول ولاقوۃ! تم کس قدر روکھے انسان ہو، اپنی فلسفہ طرازی کے مقابلہ میں اخلاق کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے اچھا تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں تم سے نفرت کیوں کرنے لگا ہوں؟" میں نے ہنسکر کہا۔

"میں تو نفرت، رغبت اور محبت وغیرہ کو کوئی شئے حقیقی سمجھتا ہی نہیں، پھر تم سے ایسا مہمل سوال کیوں کرتا" نعمانی بولا۔

"دیکھو جی تم اب مجھے بھی اپنی فلسفہ آزمائی کی دعوت دے رہے ہو میں بھی کہے بغیر نہ رہوں گا کہ جذبات نفرت و محبت ہرگز غیر حقیقی نہیں ہیں۔ فرض کر و میں تمہاری ہر بار نہایت ذلت کے ساتھ اہانت کرتا ہوں تو کیا تم اپنی طبیعت میں ایک ناگوار پیچ و تاب محسوس نہیں کروگے؟ یہ کیا ہے؟ اس ثقیل دار و گیر کو کس لفظ سے موسوم کروگے؟ غیظ و نفرت سے جب یہ کشاکش عروقی، یہ تہیج ذہنی معلول ہیں اہانت کے تو تم کس طرح اس جذبہ کو غیر حقیقی کہہ سکتے ہو؟" میں نے ترشروئی سے کہا۔

فہرست

I read all stories with great interest.

برا

میری آرزو یہ ہے کہ تیری دعا [illegible]

[illegible] بدل جائے

By leaps and bounds

A [illegible]

پس لفظ

"نعمانی" ۱۹۳۳ء کا افسانہ ہے جبکہ اشتراکیت کی چنگاری کے لئے ہندوستان میں گھاس پھوس کی کمی تھی۔ اور ہمارے افسانوں میں مزدور و سرمایہ دار کے مابین باقاعدہ کشاکش شروع نہیں ہوئی تھی۔ میرا نظریہ کبھی یہ نہیں رہا ہے کہ انسانیت کو ٹکڑیوں میں بانٹ دیا جائے۔ جس طرح کچھ عرصہ سے ہمارے ادب میں حیات و معاشرت کی عکاسی کے دعوئے کے ساتھ ایک صریح تصادم کے طوفانوں کو سمیٹا جا رہا ہے۔ میں نے سرمایہ دار کو ذلیل کر کے مزدور کا دشمن نہیں بنا لیا ہے۔ بلکہ اس کی بھول کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ شکر ہے کہ اس باب میں اب تک میرے خیالات میں تضاد پیدا نہیں ہوا ہے ہاں اس زمانہ میں مجھ پر مذہب کا رنگ بہت غالب تھا (جس پر درمیان میں مختلف دور گذر چکے ہیں) اور جواب صداقت کے ساتھ پختہ ہو گیا۔

"دو حادثوں کے درمیان" ۱۹۳۷ء کی چیز ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں زندگی ہلکی تھی اور اس پر جن حالات کا رنگ چڑھا ہوا تھا وہ بھی خوش رنگ تھا۔

"زندگی کے دو قہقہے" ۱۹۴۱ء کی پیداوار ہے جب "اثر افزائی

کے درمیان میں اپنے کو گھرا ہوا پا رہا تھا اور خیالات ماحول کو دیکھتے ہوئے کسی سمت چلے جا رہے تھے۔ نعال کی دو زندگیوں کی گنگناہٹ ہے جس کو ہر شخص صاف طور پر سُن سکتا ہے۔

"کارزارِ حیات" ۱۹۳۴ء کی پیداوار ہے۔ ۱۹۳۳ء کے افسانے نعمانی کو دیکھئے اور سال بھر بعد حقیقت و ثقاہت کی اِس جدید "قدر" کو ملاحظہ فرمائیے۔ رنگینی کی مسکراہٹ سنجیدہ ہونٹوں میں دکھائی دیتی ہے یاد نہیں آتا کہ میں اس وقت کس عالم تھا۔ شاید طبیعت ہمہ عمل بننے اور بنانے کی بے چین تھی۔ اِتنا یاد ہے کہ ریشنلزم کی طرف چلا جا رہا تھا۔

"گناہ کی یادگار" ۱۹۳۹ء کا غالباً افسانہ ہے۔ ایک بھنگن کی ٹھوکر رسیدہ زندگی نے رُوح کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ ورنہ میں نہ اسوقت اور نہ آج ایسی اولادوں کے دُنیا میں آنے کا روادار ہوں۔ اِس اعلان سے اَفسانہ کا وزن گرتا ہو تو گر جائے۔

"پلٹا" یہ بھی ۱۹۳۹ء کا ایک دبا ہوا غصہ ہے جس میں آپ اِس اظہار حقیقت کے باوجود غیظ کے شرارے ڈھونڈھے سے نہیں پا سکتے۔ ہوا یہ تھا کہ اخبارات میں لڑکیوں کی سرمستیوں کے چند واقعات نے مزاج برہم کر دیا تھا لیکن جو نظریہ میں افسانہ میں پیش کر چکا ہوں اُس کو آجتک صادق سمجھنے سے نہیں ہٹا ہوں۔

"شیریں" ۱۹۴۳ء کی پیداوار ہے جو میرٹھ سے دہلی تک آنے میں تیار ہوا تھا۔ اُس کے محرک کو تلاش کرتا ہوں تو نہ تو کسی واقعہ سے اس کی کڑی ملتی ہے

اور نہ ذہن میں کسی حقیقت کو برقرار پاتا ہوں۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ چند بے حمیت اَدیب و شاعر ضرور اسکی پیداوار کے ذمہ دار ہیں۔ وہ کون تھے۔ یاد نہیں۔

"رضیہ" یہ بھی ۳۹ء کا اَفسانہ ہے۔ اِس مجموعہ میں آپ ۳۹ء کے تین اَفسانے دیکھ رہے ہیں۔ ایک سال کی قلیل مدت میں تاثرات پر اِتنی جتائیں تعجب انگیز ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس زمانہ میں میں ایک تارک الدنیا مذہبی اِنسان کی سی زندگی میں گھر گیا تھا جس سے رہائی پاتے ہی تربیت یافتہ رنگین افسانہ قلم سے نِکل پڑا۔

"دِل جس کو پیار کرے" ۳۷ء کا اَفسانہ ہے ایک تلخ حقیقت پر مشتمل ہو سکتا ہے اور افسانوں میں اپنے تاثرات کو یاد نہ رکھہ سکا ہوں مگر جس ماحول میں یہ اَفسانہ لکھا گیا ہے اُس کا تصور کبھی میرے دماغ سے نہ نکلیگا۔ اَب میں یہ ظاہر کر کے کہ اِس کہانی کا میری ذات سے کوئی تعلق ہے اپنے اُوپر کوئی الزام لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ پسند کر سکتا ہوں کہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کر کے اُس کو رسوا کروں۔

"جب بنیاد کمزور ہو" ایک مولوی صفت طالب علم جو بہت مسکین و پاکباز نظر آتا تھا چھت پر ایک جوان لڑکی کو سوتا دیکھکر رات کے دو بجے اس کے مکان میں کود گیا اور مجھے یہ افسانہ لکھنے کا مجرم بنایا گیا۔

"مستقبل بنا رہا ہوں" ۳۵ء کے اِس افسانے کو پڑھکر پھر میرے ۳۳ء اور ۳۴ء کے تاثرات پر نظر کیجئے ۳۳ء میں مذہب غالب تھا۔

۳۳ء میں ریشنلزم کے جنون کے آثار تھے۔ ۳۴ء میں جس تاگے سے میں نے نکلنا چاہا تھا ۳۵ء میں اس کا نتیجہ دیکھ لیجئے۔ نہ مذہبیت رہی نہ ریشنلزم بلکہ ایک جدید دین کی تخلیق کر رہا ہوں۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی میں اسی لئے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔

”رنجش“ ایک افسانہ ہے اور بس۔

قیسی رامپوری

دوران قیام حیدرآباد

اپنی ہی حسرتوں کے نام جن میں سے کبھی
ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ قلم نے سینکڑوں ہیرو
پیدا کر دیئے لیکن اپنی ذات ______
اللہ بس باقی ہوس

قیسی رامپوری

نعمانی

جوانی میری برباد ہو گئی ہے اب تو آجاؤ
مزاج ڈھل گیا ہے محبت ہو گئی ہے اب تو آجاؤ

[illegible] دن [illegible] جا رہے ہیں [illegible]
منتظر ہیں یہ دل بھی ہے [illegible] ہم اب تو آجاؤ

[illegible]

God knows what is in store for

[illegible]

Very good book.

" آپ خیر سے ہیں تو سیکنڈ ایر میں لیکن اکڑتے کس قدر ہیں " ایک لڑکے نے اس کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا، اس نے اپنے ہمہ اوقات خاموش رہنے والے لبوں میں قدرے " تحریک تبسم " پیدا کر کے شانہ پر سے اس لڑکے کو دیکھا اور دروازہ بند کر لیا۔

(۱) تین ہزار روپیہ کا پہلا انعام اس لڑکے کو دیا جائے گا جو اِس سال علیگڈھ کالج کی ڈبیٹنگ سوسائٹی (مجلس مذاکرۂ علمیہ) میں قومی فلاح کیلئے ممکن العمل و موثر ترین تجاویز پر کامیاب بحث کر سکیگا۔

(۲) پانچ ہزار روپیہ کا پہلا انعام اس خاتون کو پیش کیا جائیگا جو معاشرت و تمدن کے ارتقائی مدارج کو مدنظر رکھ کر ہندوستانی خواتین کے لئے ایک ایسا لائحۂ عمل مرتب کر سکے جس کے ماتحت وہ اپنے عمرانیات کو برقرار رکھتی ہوئیں مشرقی تہذیب میں (بمقابلہ مغربی تہذیب کے) اپنی حیات زیادہ عمدگی و آسائش سے بسر کر سکیں۔

(۳) دس ہزار روپیہ کا گرانقدر انعام اس فردِ واحد یا جماعت کے ارکان کو دیا جائے گا (ارکان کی تعداد دس سے متجاوز نہیں ہونی چاہیئے۔)

جو وسیع ہندوستان میں سب سے زیادہ اہم و نمایاں رفاہی خدمات انجام دے سکیگا یا دے سکیں گے۔ رفاہی خدمات کی تصریح صرف اس قدر کیجا سکتی ہے کہ وہ سیاست، مذہب، معاشرت، تمدن، اخلاق و مراسم وغیرہ سے متعلق ہوں گی۔ رہی اُن کی نوعیت خصوصی واہمیت نوعی تو اس کا انحصار "رضاکار" کی اپنی طباعی پر موقوف ہے۔

(۴) سو روپیہ کا حقیر انعام اُس مخلص کو دیا جائے گا جو حقیقی حاجتمندوں کے مصدقہ وصحیح پتے اور نادار یا عسرت زدہ شرفاء کے نام (مع پتوں کے) معلن کے پاس روانہ کرے گا۔

نوٹ:۔ معلن صاحب اپنا نام اور پتہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے، لہذا تمام خط وکتابت ایڈیٹر اخبار "خادم" کے پتہ پر کیجائے۔

اخبار "خادم" کا تازہ پرچہ نعمانی کے ہاتھ میں تھا اور مسکرا مسکرا کر ان انعامات کی فہرست کو دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً دروازہ کھلا اور مولانا نجیب قزوینی (پرشین پروفیسر) کمرے میں داخل ہوئے۔

"میاں نعمانی! آہا تمہارے پاس بھی وہی پرچہ ہے۔ بھئی بڑی مسرت ہوئی —— بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ہندوستانی متمول لوگوں کو بھی خدمات عامۃ الناس کا خیال آیا، یہ کیسی اندھیر کی بات تھی کہ یہ لوگ اب تک تنہا اپنی دولت سے مزے اڑا رہے تھے، اِس تحریک سے اب اُمید ہے کہ رفاہی خدمات کے شوق کی قوم میں ایک لہر دوڑ جائے گی اور انشاء اللہ ہماری بہت سی پراگندیوں کا ازالہ ہوجائے گا ——" مولانا

"اہانت کے محل پر پہلے غور کرو ۔۔۔۔"

"میں محل وحل کچھ نہیں جانتا" میں نے اس کا قطع کلام کر کے کہا۔ جناب اگر گورنمنٹ بھی آپ کی طرح حقیقی وغیر حقیقی جذبات کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر قانون بنایا کرے تو اُس کو تدوینِ دفعات میں اس قدر مشکلات پیش آئیں کہ باید وشاید" میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"آہا تم نے کام کی باتوں کا آغاز کر دیا" نعمانی بولا "قانون ساز جماعت تدوین قانون کے موقعہ پر بہت کم نفسیات کو مدنظر رکھتی ہے۔ زیادہ تر وہ استغراق دغیر آئینی باتوں سے پُر ہوتا ہے، تاکہ عدالتوں کے اخراجات نکلتے رہیں، یہ کہاں کا قانون ہے کہ ایک نادار انسان فاقوں سے تنگ آکر چوری کرتا ہے تو سزا پاتا ہے۔ لیکن ایک مسرف دولت مند اپنی تنہا ذات پر ہزار روپیہ خرچ کر ڈالتا ہے تو حکومتیں اس پر کوئی حرف گیری نہیں کرتیں۔ اس نادار انسان کی سارقت بربنائے ضرورت تھی لیکن مسرف دولت مند کا اسراف بالکل ہی غیر ضروری ہے، اُس کو کیا حق حاصل ہے کہ اپنی اکیلی ذات پر اتنا صرف کیا کرے؟

ایک شخص والدین کی خدمت نہیں کرتا یا حقوق العباد کو بالکل فراموش کئے ہوئے ہے تو قانون اس سے بازپرس نہیں کرتا۔ اس پر کوئی دفعہ عائد نہیں کی جاتی۔ لیکن اگر وہی شخص حکومت کے حقوق (جن کی وہ کمتر مستحق ہوتی ہے) ادا کرنے میں ذرا کوتاہی کرتا ہے تو سزایاب ہوجاتا ہے، اُس پر متعدد جرم عائد کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ شخص تو سزا پاتا ہے جو شہوت کے

دیو کو زیر کرتے ہوئے کہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن اُس عیاش رئیس سے کوئی باز پُرس نہیں کی جاتی جس کا ایوانِ عیش شب و روز پری خانہ بنا رہتا ہے۔ محلہ میں کوئی شخص بے یار و مددگار بستر علالت پر پڑا ہے نہ کوئی عیادت کنندہ موجود ہے۔ نہ پرسانِ حال۔ اب اہل محلہ پر اِس بے توجہی و غفلت کی بناء پہ کوئی جرمانہ نہیں کیا جاتا لیکن اگر وہ اپنی مجبوریوں کے باعث چند ماہ کا کرایہ ادا کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے تو اُس کے اثاث البیت پر قرقی لے آئی جاتی ہے! یہ ہے قانون جس پر حکومتیں ناز کیا کرتی ہیں۔ کیا تم مجھ سے اپنے قانون کی مزید حقیقت سُننا چاہتے ہو؟ کیا میں تم کو بتاؤں کہ نظامِ معاشرت، نظامِ حکومت، نظامِ تمدن و مجلس کس قدر غیر مربُوط کس درجہ غیر مکمل، کیسا اَدھورا اور کتنا ناقص ہے۔"

"نعمانی تم ——— (اِنقلاب پسند) کی سی ذہنیت رکھتے ہو۔ تم شاید اُن لوگوں میں سے ہو جو ہر شئے کے روشن پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اس کی تاریکیوں میں جھانکنے کے عادی ہوتے ہیں، جو آفتاب کے نور سے چشم پوشی کر کے اُس کے تاریک عکس کے متجسس رہا کرتے ہیں؟" میں نے ذرا بد مزاجی سے کہا۔

"میں تو رواقی ہوں قدیر۔ کسی شے میں کیڑے نکالنا جانتا ہی نہیں، ہاں لیکن ذہنیت عامکی کورانہ تقلید کرنے کا عادی نہیں۔ نہ میرا ضمیر اس کی اجازت دیتا ہے۔ واقعات، اپنے صحیح معنی میں نہ سمجھے جانے کی شکایات لے کر میرے پاس آتے ہیں۔ میرے پاس ہی کیا وہ سب کے پاس اسی طرح جاتے ہیں

لیکن تم لوگ ان کو ٹالدیا کرتے ہو اور میں ان کی شنوائی کرتا ہوں"

نعمانی ایک عجیب وغریب کیریکٹر کا انسان تھا۔ کالج کے تمام طلبا، اس کو کم آب بے مہر، مغرور، خود آگاہ اور بجس انسان سمجھتے تھے۔ لوگ ہر اس شخص کے لئے اس قسم کا فتویٰ صادر کر دیا کرتے ہیں جو ان کے مقررہ معیار انسانیت پر پورا نہ اترے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ تنہا تنہائی پسند، مجالس سے ہمیشہ احتراز کیا کرتا تھا، اگر اس کے کردار کا ذرا غور سے تجزیہ کیا جائے تو وہ در اصل حساس، رقیق القلب، درد آشنا، کم سخن، دیر آشنا اور شرمیلی عادات کا انسان تھا، یہ عادتیں ہر اس شخص میں ہونی لازمی ہیں جو بیگانۂ احباب، مفکر اور مجالس سے گریز کرنیکا عادی ہوتا ہے، اس کے ساتھ ہی وہ زبردست — (صاحب فیوض) کسی کو مبتلا تکلیف دیکھنے کی تو تاب بھی نہ لا سکتا تھا، مجھے اس کی صرف یہ عادت ہی بھاتی تھی کہ وہ ہمہ وقت شخصی امداد کے لئے مستعد رہتا تھا اس کی کم سخنی، محجوب اطوار اور خائف خصال کو میں مطلق پسند نہیں کرتا تھا، اگرچہ اس کے کریکٹر کے بعض اجزا اوپر ایک اضمحلال و استبداد سا مسلط نظر آتا تھا، لیکن وہ فی الحقیقت مقید طبیعت اور پست خیالات کا انسان نہ تھا۔ ممکن ہے میں نے اس کی طبیعت کو "اسیر" سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ مولانا کو اس نے کس قدر غیر رسمی طرز پر اپنے کمرے سے ٹالدیا تھا۔ اسی طرح وہ تمام رسمی تکلفات اور دستوری مراسم کو ٹھکرا دیا کرتا تھا۔ کالج کے لڑکوں نے اس کو بہت کچھ اپنا سا بنا لینا چاہا لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے جب تک

اس کی صحیح فطرت کا مطالعہ نہیں کیا تھا اُس وقت تک اُس کے اطوار کو زیادہ تر (منافقت) پر محمول کرتا رہا لیکن جیسے جیسے اس کے اور میرے درمیان سے "عدم واقفیت" اٹھتی گئی میں اُس کو خوب سمجھتا گیا۔

بیشتر اوقات میں اس پر خاموشی ہی طاری دیکھا کرتا تھا، لیکن جب اُس کے اعضا پر سے یہ طبعی کسل دور ہو جاتی تھی تو وہ دیوانوں کی طرح خود بخود مسکرانے لگتا تھا اور سر کو کبھی اثبات میں اور کبھی منفی حرکت کے ساتھ جنبش دیتا رہتا، اس کے ساتھ دفعتاً اپنے دماغ میں اُمڈتے ہوئے طوفان تخیل کو اس طرح مجھ پر اُگل دیتا کہ میں نہ تو اس کی گفتگو کے موضوع کا پتہ لگا سکتا تھا نہ اس کی تقریر کے مسلسل فقروں کو کسی گذشتہ واقعہ سے منضبط کر کے کوئی نتیجہ مرتب کر سکتا تھا، تھوڑی دیر بعد جب اُس کو میری اس "عدم تفہیم" کا احساس ہوتا تو وہ ہونٹوں کو بھینچ بھینچ کر اپنی مسکراہٹ واپس ضبط کرنے لگتا۔ اور پھر چپ ہو جاتا، وہ اپنے تخیلات کی وسعت میں جس سرعت سے بذریعہ الفاظ نہیں دوڑا سکتا تھا۔ بعض اوقات میں اُس کے ان مجنونانہ تبسم میں ظاہرداری کے ساتھ شرکت کر لیتا تو وہ یقین کرنے لگتا تھا کہ میں کما حقہٗ اُس کے مفہوم کو سمجھ رہا ہوں، پھر وہ مجھ سے اپنے خیالات کی تصدیق چاہنے لگتا۔ میں کچھ واقف ہوتا تو ہوں ہاں کرتا۔ بس گنگ ہو جاتا۔ اس پر وہ جھلا اُٹھتا اور اپنی فرزانہ شان قائم رکھنے کی خاطر مجھ سے وہ تمام باتیں کہہ ڈالنے پر مجبور ہو جاتا جو اس کے دل کو گدگدایا کرتی تھیں۔ وہ باتیں بڑی ہی

پُر لطف اور قیمتی ہوا کرتی تھیں۔ میں اُس کے تخیل کی دُور رس قدرت سے دَنگ رہجاتا تھا۔

میں طبعاً ذرا اَلم پسند واقع ہوا ہوں۔ بارہا میں نے خوشدلی اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن طبیعت خوش نہیں ہوئی، اِس کے برعکس نعمانی اگرچہ ایک خاموش مفکر تھا جس کو (نیتجتہً) اپنے عجیب تخیل کے سلسلہ میں بہت کم مسرور رہنے کے اِمکانات تھے لیکن حیرت ہے کہ اس کی طبع ثانیہ (میں اس کی طبیعت کو دو حصّوں میں اِس وجہ سے منقسم کر رہا ہوں کہ اس کی اصل فطرت مفکر تھی) مسرت پسند تھی۔ میں نے اپنی افتادِ طبع سے بغاوت کر کے اس باب میں اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن اِنسان اپنے بنائے سے کچھ نہیں بن سکتا۔

"نعمانی!" میں نے دریافت کیا "خوش باش دمے ــــــــ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟" آج وہ غیر معمولی طور پر شگفتہ دل اور حاضر طبع تھا، بے ساختہ بول اُٹھا:۔

یا در درونِ قبۂ اِیں آسماں مباش
یا از جراحتے کہ رسد دِل گراں مباش

دیکھا جائے تو شاعر نے اِس میں بڑے پتہ کی بات کہدی تھی جس الوالعزمی و قائم مزاجی کی تعلیم یہ شعر دے رہا تھا۔ وہ میرے شورشِ حیات کو تسکین دے سکتا تھا۔ لیکن ان شعراء کا کیا اعتبار۔

مجھے خاموش دیکھکر اُس نے خود کہنا شروع کیا "خوش و خُرم رہنا تو

یعنی انسانی نیچر ہے۔ جب دُنیا بنی تھی اور اُس کے وسیع دامن میں اتنی مخلوقات آباد نہ تھیں، جس قدر آج ہیں تو اُس وقت بھی تم سمجھتے ہو انسان مغموم رہا کرتا تھا؟ "مجھے تو اس کی شادمانی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی" میں نے کہا۔

"آپ بھی عجیب آدمی ہیں" وہ بولا "مسرّت تو بالکل فطری کیفیت ہے۔ غموم کی پیدائش تو تکوین عالم کے بہت عرصہ بعد ہوئی ہے، انسان آزاد تھا۔ ہر شئے پر اُس کا قبضہ تھا، زر، زمین وغیرہ کی اس قدر کسی کو طمع نہ تھی، پھر تم خود اندازہ لگا لو کیا اس کی زندگی مغموم ہو سکتی ہے یا مسرور؟ وہ کوئی واقعات زندگی و سانحاتِ حیات رکھتا ہی نہ تھا۔ ممکن ہے واقعہ موت نے اس کو سب سے پہلی دفعہ متاثر کیا ہو اور وہ مدتوں پریشان رہا ہو کہ یہ کیا بلا ہے اور اس کی دستبرد سے جو جانوں کا اتلاف ہوتا ہے، وہ قابل رنج ہے یا وہ بھی اس کی آزاد زندگی کا ایک غیر معین مشغلہ ہے؟ جونہی اس کی عادت واقعات کے کبیدہ شعبوں پر غور کرنے کی ہوتی گئی وہ رنج و آلام سے آشنا ہوتا گیا، اُس کی حسیات پر ثقل طاری ہونے لگا شروع میں وہ اپنی آزاد و مسرت کی بھی قدر نہیں جانتا تھا لیکن امتداد وقت نے جب متضاد واقعات پیش کرنے شروع کئے تو اُس کے احساسات میں اثر گیری کی قوت بھی تیزی سے پیدا ہونے لگی۔ خیر تو کہنے کا مقصد یہ تھا کہ خوش رہنا بالکل نیچرل ہے اور غم چونکہ واقعات کا پیدا کردہ ہے اس لئے یہ اَن نیچرل ہے، جو لوگ واقعات پر تسخیر کی قدرت رکھتے ہیں۔

اُن کو غم و رنج زیادہ متاثر نہیں کرتے " وہ خدا جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا، دفعتاً اُس نے بلند آواز سے کہا " بات یہ ہے کہ تم ہر شئے کا وجود اُسی نہج پر تصور کرنے کے عادی ہو، جس نہج پر دنیا نے تم کو ڈال دیا ہے تم واقعات کے تابع اپنے مشاعر کو کر بیٹھے ہو، ذرا بلند خیالی سے کام لو، اور ژرف نگاہی اختیار کرو۔ اہل دنیا کس قدر کور واقع ہوئے ہیں۔ ایک انسان کو تمہارے سامنے زمین پر پچھاڑ کر ذبح کیا جاتا ہے۔ ہائیں! خوف کی پھریری کیوں لیتے ہو تم؟ ——— یہ آپ کے مشاعر و احساسات کا عالم ہے! سمجھتے ہو میرے الفاظ نے تم پر خوف طاری کر دیا؟ کیونکہ تمہارا ذہن، تمہاری قوت متخیلہ تمہارا ادراک ہمیشہ ان الفاظ کا یہی نتیجہ دیکھتا چلا آیا ہے۔ اس طرح ہوتی ہے احساسات کی تشکیل، یوں ہوا کرتی ہے واہمہ کی تخلیق ——— " دفعتہً ڈاکیہ کمرے میں داخل ہوا اور تقریباً دو سو لفافوں کا ڈھیر نعمانی کی میز پر لگا کر چلدیا۔ نعمانی نے لپک کر اُن کو ایک الماری میں بند کر دیا۔

" نعمانی " یہ ——— اُس نے میرا سوال تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ اُس کو ٹالنے کے لئے پھر ایک نئی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

" قدیر آج کل میں اپنی طبیعت میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی محسوس کرتا ہوں۔ میں شدت سے ایک طمانیت بخش ذات کی ضرورت محسوس کیا کرتا ہوں۔ اللہ اللہ " ! اُس نے اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے کہا " انسانی تخیل میں بھی کس قدر قدرت ہے، تم شاید ہنسو گے قدیر۔ خیر ہنسو۔ میں آجکل ایک ایسی ذات کے تخیل میں غرق رہتا ہوں جو میری شکستہ روح کے

شگافوں میں، میرے درماندہ اعصاب میں میری فسردہ حسیات میں اپنی اعجاز آفرینی سے تازگی کی روح پھونکدے۔ جو میری ذہنی و جسمانی کوفت کو فرحت سے بدل ڈالنے کی قدرت رکھتی ہو جو اس خراب آباد جہاں میں اپنی تبسم انگیزیوں سے میری آنکھوں کے سامنے ہردم مناظرِ طور پیش کرتی رہے۔"

"اچھا زیادہ شعریت نہ بگھارئے، میں ویسے ہی سمجھ گیا ہاں تو جناب بھی ہوئے اسیرِ حلقۂ گیسو، پھنسے کسی کے دامِ محبت میں؟ واہ بھیا فلسفی! اب آئی تمہاری شامت۔ ع

ایک ساتھ ہی آتی ہے شامت بھی طبیعت بھی

میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"آپ تو ہیں احمق" وہ کسقدر تلخی سے بولا "تم لوگوں کی یہ تنگ خیالیاں ہی تو تم کو کسی شئے کے بسط پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ خدا جانے تم میرے بیان سے کیا سمجھ گئے۔ جس ذات کی میں ضرورت محسوس کرتا ہوں وہ درحقیقت مقیدِ آب و گل نہیں ہے۔ وہ کوئی جسمانی وجود نہیں رکھتی ہے"

"تو پھر جناب۔ آدم آپ بھی مغموم صورت بنا کر بیٹھے رہا کیجئے۔ اللہ میاں آپ کے لئے بھی کوئی حوا ثانی پیدا کردے گا" میں نے پھبتی کے طور پر کہا، وہ بھی ہنسنے لگا۔

"نعمانی! تمہارے تعشق سے خالی لمحاتِ حیات۔ تمہاری بیگانۂ محبت روح ایک عورت کی تمنا کر رہی ہے، کیا تم اب بھی انکار محبت کی جراءت کر سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دیوانے شاعر! اے وہ ہستی جو اپنی تمام عمر اوہام و سطحیات کی پرستش میں بسر کر دیتی ہے۔ تجھے قدرت نے حقائق کے اعماق میں نظر ڈالنے کی ذرا صلاحیت نہیں بخشی ہے، پاگل انسان! پامال فریب محبت مخلوق! میں کسی سے محبت نہیں کرتا۔ میں افادیت کی بنا پر اپنے تخیل میں ایک مسکن ذات کی تمنا محسوس کرتا ہوں تو اس کا تمہاری جنابہ محبت صاحبہ سے کیا تعلق ہے؟"

"اور شائستہ گالیاں دے لو ـــــ اچھا اس ذکر کو چھوڑو، کیا میں تمہارا بے تکلف دوست ہونے کی حیثیت سے دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ اتنے خطوط تمہیں کہاں سے موصول ہوئے ہیں، اور ان کا کیا مضمون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

نعمانی نے ایک کتاب اٹھائی۔ پھر بولا "عزیز دوست پہلے مجھے ذرا اتنا بتا دو کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے اور یہ کون سے پریس میں چھپی ہے؟"

"عجیب آدمی ہو مجھے کیا معلوم کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے اور کہاں چھپی ہے۔ ذرا دکھاؤ تو بتا دوں" میں نے جواب دیا۔

"بس تو میں بھی ان آئے ہوئے خطوط کو پڑھ لوں تو بتا سکتا ہوں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور ان میں کیا مضمون ہے،؟" تم صریح طور پر دیکھ رہے ہو کہ وہ ابھی آئے ہیں اور ان کے مضامین میرے لئے بھی تا ہنوز اسی طرح حالتِ نکرہ میں ہیں جس طرح تمہارے لئے اس کتاب کا موضوع"

"یہ آپ اپنی "اقلیدسیت" کہیں اور جا کر گھا دیئے، تم کو اس بات کا

علم تو ضرور ہوگا کہ وہ کس امر سے متعلق ہیں؟" میں نے کہا۔

"تو پھر تم بھی یہ ضرور جانتے ہوگے کہ یہ کتاب کوئی ناول نہیں ہے۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"معاذ اللہ" میں نے جھلا کر کہا "اس کے کیا معنی ہے؟"

"اِس کے یہ معنی کہ مکاتیب بھی از طرف محبوب نہیں ہیں ——"

"استغفر اللہ" میں ناراض ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "تم سے تو وہ بات کرے جس کا دماغ تمہاری مانند چل نکلا ہو۔"

"بیٹھیے میرے رفیق قدیم، اجی آپ جامے سے کیوں باہر ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا تشریف تو رکھیے، میں جناب کو بتا دونگا —— اُن کے مضامین۔ہاں صاحب تو یہ کتاب کوئی ناول ہے ——؟"

"اعوذ باللہ من النعمانی"۔ میں نے اپنی جگہ لیتے ہوئے کہا "میں تم سے بیزار ہوا جا رہا ہوں۔ سبحان اللہ اے تیری قدرت! لو صاحب یہ ہم کو بناتے چلے ہیں۔"

"تم بہت زود رنج انسان ہو جی۔" وہ بولا۔

"اور دس بیس گالیاں دے لو، اب تک تین چار تو دے چکے ہو۔"

"قدیر میں بتا تو دوں لیکن تم تمام زمانہ میں ڈھنڈورا پیٹتے پھرو گے" اُس نے رکتے ہوئے کہا۔

"اپنے دل کو بالجبر آمادہ نہ کرو۔ اگر یہ فی الحقیقت کوئی راز ہے، تو

میں اس شجرِ ممنوعہ کے پاس نہیں جانا چاہتا، اور اگر ایک معمولی بات ہے تو میں اس کو ضرور معلوم کرونگا" میں نے کہا۔

نعمانی بغیر ایک لفظ کہے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک الماری کھول کر خطوں کا پلندہ میرے پاس لا ڈالا۔ میں نے دھڑکتے دل سے ایک لفافہ اٹھا لیا چاک کر کے پڑھا تو خاک بھی سمجھ میں نہ آیا، دوسرا پڑھا تو اس میں کسی نے اپنے کارناموں کی لمبی چوڑی فہرست پیش کی تھی، تیسرا خط بھی اسی قسم کی خرافات سے پُر تھا۔ میں نے جھلا کر لفافوں کے پلندے کو پھینک دیا اور چلدیا۔

نعمانی کوئی حسین وجمیل انسان نہ تھا، لیکن اس کے متناسب اعضائ اُس کی بلند گردن اس کا فراخ سینہ ایک ایسی جاذبیت پنہاں رکھتا تھا کہ اس ایثار کے پتلے پر نگاہ جم جانے کے بعد ہدایا، پسندیدگی و مفتونیت ہی لیکر لوٹتی تھی، وہ دنیا میں بالکل تنہا تھا۔ اعزا، واقربا سے کب کسی کو نفع پہنچتا ہے، اگر نعمانی بھی اُس سے محروم تھا تو اس کی محرومیت قابل افسوس نہ تھی۔

بہت دُور کے رشتہ میں ایک زمیندار صاحب اس کے چچا ہوتے تھے، جنسے وہ غالباً تمام عمر میں صرف دو دفعہ ملا ہوگا، احسان صاحب بھی اپنے زمیندارے میں مگن تھے چنانچہ اُن کو بھی نعمانی کا کوئی خیال نہ تھا، اپکے گرمی کی تعطیلات سے چند روز قبل خدا جانے کیوں اُن کو اپنا دور افتادہ بھتیجہ یاد آیا کہ اُنھوں نے اُس کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی۔ نعمانی کو اُن سے ملے ہوئے تقریباً پانچ سال ہوچکے تھے، اُس کو بھی خیال آیا کہ چلو اِس دفعہ چھٹیاں وہیں گذارو۔

احسان صاحب معمولی لکھے پڑھے آدمی تھے لیکن تھے بیدار مغز
محنتی انسان۔ زمیندارے کا اس قدر کامیابی سے چلتے رہنا، اُن کے تدبر
کا ہی نتیجہ تھا ظاہر ہے کہ اپنے فرائض میں بغایت درجہ منہمک رہنے والا انسان
اپنی ایک علیحدہ ہی دنیا بنا لیتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس پُر واقعات دُنیا کے
عاجل تغیرات سے ایک حد تک بے خبر تھے کیا آپ اُن مردانِ شباب
باختہ سے ہمدردی نہیں رکھتے جن کو شباب کے نازک ہمدم تنہا چھوڑ کر
راہی عدم ہو جاتے ہیں؟ بعض لوگ ان کی اِس خوش نصیبی پر رشک کرتے ہیں
بڑھاپا دراصل دورِ انحطاط کا نام ہے، اِس عہد میں اِنسان کو ہر جہت سے
سکون پذیر رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن سکون نصیب ہو کہاں سے جب کہ
"بڑی بی" اب بھی جلانے کو زندہ بیٹھی ہوں ———— بہر نوع احسان صاحب
پر پروردگار کا احسان تھا کہ وہ اِس "لحمی ہیکل" سے رہائی پا چکے تھے۔ ان
پر صرف یہی اِحسان آلہی نہ تھا، بلکہ کردگار نے اُن کو بدمزاج مرحوم بیوی کی
"اذیت آفرینیوں" کی تلافی کے لئے ایک نیک مزاج بیٹی بھی عطا کی تھی
———— ہاں نجمہ اس معصوم کلی کی مانند تھی جو حورِ بہشتی کے زیب گلو رہتی
ہو، اس غیر ملوث قمری کی مانند تھی جو فرشتوں کی بستی میں نغمہ زن رہتی ہو،
اس سدا بہار پھول کی طرح تھی، جس کو مکروہاتِ دنیاوی کی مسموم ہوا نے
کبھی چھیڑنے کی جراءت تک نہ کی ہو، دیہات کی سرسبز وسعتیں، جنگل کی
فرحت بخش لطافتیں، بے ضرر لوگوں کی معصوم بستی ایک ایسا پاک ماحول
تھا، جس کے دامن کی پلی ہوئی لڑکی کے لئے بجز حور کے اور کسی لفظ کا اطلاق

کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا، نجمہ کی نظروں سے بہار کی نکہت بیزیاں، خزاں کی تباہ کاریاں اور موسم برشکال کی لطافت آفرینیاں کئی بار گزر چکی تھیں وہ اُن سے متاثر ہوتی تھی۔ ضرور ہوتی تھی لیکن کس طرح؟ جس طرح معصوم ہرنی خار دشت سے قطع نظر کر کے صحرا کے بسیط دامنوں میں مصروف خرام رہا کرتی ہے، وہ اپنا گہوارۂ عیش، اپنی منتخب تفریح گاہ اپنی دلچسپیوں کا مرکز اپنے مکان کو سمجھتی تھی۔

اس کو مطلق علم نہ تھا کہ حریص بھونرا کیوں دن بھر پھولوں کے شاداب تختہ کا طواف کیا کرتا ہے۔ وہ مطلق بے خبر تھی کہ جانباز پروانہ کیوں چراغ پر نثار ہو ہو کر گرتا ہے اور جب اُٹھتا ہے تو چکر کاٹنے ہی کے لئے۔ جل مرنے ہی کے کارن، فنا ہونے ہی کے واسطے۔

سیرت کے اظہار میں مجھ سے ذرا شعریت زیادہ سرزد ہو گئی۔ لیکن میں مجبور ہوں ——— ہاں مجبور ہی سمجھئے۔ آپ ایک پھول کی نزاکت و لطافت کا مجموعہ، رعنائی و نکہت کا مرقع نہیں کہیں گے تو کیا کہیں گے؟ اب اگر میں نجمہ کے لئے یہ کہوں کہ وہ بھی اس دبکتے ہوئے ہیرے کی مانند تھی، سمندر کے آبی پردوں میں مستور رہنے والے اس موتی کی طرح تھی جس کی جانب آج تک حریص نگاہ نہ بڑھ سکی ہو تو اس میں کیا مبالغہ ہے، اسکو خداوند بخشندہ نے ایک بے ریا دماغ عطا کیا تھا، اور ایک پاک روح!

احسان صاحب خود بھی ایک نیک نفس، متواضع اور خوش اخلاق انسان تھے، پھر نجمہ میں جمال ہمنشین کیوں نہ اثر کرتا۔ وہ دُکھ درد کے لئے

تسکین کی دیوی تھی۔ یاوسی دورماندگی کے لئے پیام طمانیت اور اضطرار و ہراس کے لئے "حور امید"۔ وہ اپنے غمگسارانہ برتاؤ سے۔ اپنی اندمال اثر اداؤں سے زخمی دلوں، شکستہ طبیعتوں اور ہراساں دماغوں کو بشاش کر دیا کرتی تھی، تعلیم و تربیت کا جہاں تک اس کی ذات سے تعلق تھا وہ تربیت کے باب میں موجودہ نصاب تعلیم کی پامال بہت سی لڑکیوں سے افضل و اعلیٰ تھی، تعلیم کے معنی اگر درسی کتب کو رٹ لینا ہے تو ہمیں کہنے میں باک نہیں کہ نجمہ اس قسم کی تعلیم سے بالکل محفوظ تھی، ہاں اس نے اپنی معلومات مفید کتابوں کے ذریعہ اس حد تک بڑھالی تھی، جس حد تک وہ اس کی آئندہ زندگی میں ممد و معاون ثابت ہو سکیں، دماغ ایک باب میں معدہ سے بہت زیادہ مماثلت رکھتا ہے، جس طرح معدہ کو زیادہ پر غذا کر دینے سے اس کا فعل خراب ہو جاتا ہے، اسی طرح دماغ میں بھی سارے زمانہ کی معلومات ٹھونس لینے کی سعی کرنے سے، ہر مسئلہ میں درک تامہ حاصل کر لے کی کوشش کر لے سے خیالات بہک جاتے ہیں اور انسان سب کچھ سیکھ لینے کی ہوس میں سیکھا سکھایا بھی فراموش کر جاتا ہے، نجمہ عورت تھی، اپنی زندگی کے نصب العین کو سمجھتی تھی، اگر شعر و ادب سے اس کو مس نہ تھا تو کوئی جائے حیرت نہ تھی، اگر وہ سیاست و خطابت کی جانب متوجہ نہ تھی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی، اگر وہ رقص و سرود کی تعلیم حاصل کرنا اپنے نسوانی مقصد کے لئے عار سمجھتی تو محل استعجاب نہ تھا، لیکن اگر وہ شوہر پرست بیوی بننے سے

بے پرواہ ہوتی تو افسوس کی بات تھی، اگر وہ تربیت اطفال کی ماہر بننا مذموم سمجھتی تو سخت صدمہ کی بات تھی، اگر وہ اپنے مختصر مکان کی ملکہ بننے میں شرم محسوس کرتی تو بڑی الم انگیز بات تھی۔ اگر وہ تردید پردہ میں قرآنی اقتباسات، تاویل کے ساتھ پیش کرنے کی عادی ہوتی تو اس کا ہونیوالا شوہر مستحق رحم وہمدردی تھی۔

اِس مختصر بستی میں نہ تو سردابہ ہائے عیش وطرب، کی زرین دُوز عمارتیں تھیں، نہ رقص وسرود کے سربفلک قصر ایستادہ تھے، نہ یہاں ننگ انسانیت افعال کا ارتکاب، ہوتا تھا، نہ حیا سوز حرکات کا اصدار، اس قصبہ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا، ہاں مدرسہ ہی۔ تعلیم گاہیں مشن اسکولوں کا جو مقصد ہوتا ہے، وہ سب پر ظاہر ہے، اِس مدرسہ کا عملہ صرف دو نفر پر مشتمل تھا۔

ایک معمر پادری صاحب، اور ایک اُن کی جوان، شیریں ادا شوخ وشنگ صاحبزادی ——— یہ تھے وہ ارکان جن سے مشن دیہاتی بچوں کے لئے ایک پراثیار تعلیم وتربیت کا متوقع تھا۔

سعدی صاحب نے دمشق کے قحط میں ”یاروں“ سے عشق فراموش کرا دیا لیکن ہندوستان کے لوگوں نے فراموش کاری میں دمشقیوں کے مقابلہ میں زیادہ سرگرمی کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ سمت چھپن میں نہ صرف ”یاروں“ نے عشق فراموش کیا بلکہ ”زاہد شکم پرور“ نے مذہب کو بھی خیرباد کہا۔ اس پر آشوب زمانے میں مذہب جیسی مقدس شئے کو

بالعوض یکمشت غلہ جس فیض رساں جماعت نے خریدا تھا وہی مشن ہے، یہ اُسی "مذہب ربا" زمانہ کی یادگاریں ہیں جو ہم کو "کالا صاحب" کی شکل میں نظر آتی ہیں، خیر تو اس مدرسہ کے بانی بھی اِسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے. جنھوں نے دین کی قیمت ایک مُٹھی غلہ کافی سے زیادہ سمجھی تھی ✗

مس فیض (مدرسہ کے پادری صاحب کی صاحبزادی) جن کو من المہد الالحد (اگر وہ شادی کرنا پسند نہ کریں) مس بنے رہنے کے اِختیارات کامل حاصل تھے جو ہر طرح امتعۂ نسائیت فروخت کرکے بھی دائمی طور پر مس کہلائے جانے کی مستحق تھیں، ایک تنا سب الاعضاء آہو چشم اور مترنم آواز والی حسینہ تھیں، اُن کی وہ حیران آنکھیں وہ بیچین حرکات، وہ بیباک اَدائیں اور وہ غیر مانوس حجاب اطوار جو اُن کے کیریکٹر کے دلکش ترین اجزاء تھے ایک ایسی ہوس خیز محبت. کے داعی تھے جس کی تقدس سے دور کی نسبت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔

قصبۂ سارن کوئی ریلوے اِسٹیشن نہ تھا. چنانچہ نعمانی کو یہاں لاری میں آنا پڑا. اِحسان صاحب کا صاف وسادہ مکان جس کے احاطہ میں کچھ تو خودرو درخت تھے، کچھ نجمہ کے ہاتھوں کے رہین منت پودے لہلہارہے تھے۔ نعمانی کو بہت پسند تھا۔ اس بار اس نے اس خاموش پرسکون اور آزاد ماحول میں ایک اور ایسی نظر نواز، جاذب توجہ اور خوش آیند فضاء کا اضافہ پایا جس کو نجمہ کے "دَور نہاد" نے پیدا کر دیا تھا۔

دل دوسروں کے ہاتھوں بیچ کر خود حیران رہ جانا ——————

یہ ہے وہ توضیحِ محبت جو ایک بزرگ صوفی کے تصوف آب دماغ کی پیش کردہ ہے لیکن اُس پر ——— اِس طریق دِل فروختن پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

ایک تو مشتری فی الفور دام اَدا نہیں کرتے، بلکہ بالاقساط بھی ادا کرنے سے قاصر رَہ جاتے ہیں۔

دوسرے اگر دلفروش صاحب "حصولِ حیرانی" کے لئے سستا مہنگا سَودا طے کر لینے پر راضی بھی ہو جاتے ہیں تو بائع کی اِس رعایت سے مشتری صاحب فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

گذارش یہ تھی کہ نہ تو میاں نعمانی دلفروش تھے نہ نجمہ "مشتریٔ دل"، لیکن اُن کا (نعمانی کا) وہ کسی طمانیت بخش ذات کی آرزو کرنیکا آخر راز کیا تھا؟ کیا اُنکا دِل کسی مخلص کا جویا تھا؟ اگر یہ بات تھی تو میں اپنے سے شرما رہا ہوں۔

ایک ہفتہ نعمانی کو یہاں آئے ہوئے ہوگیا۔ نجمہ اس کے تصورات میں "ہلالی ہیئت" سے اب "بدری صورت" اختیار کرتی جا رہی تھی، مجھے معلوم نہیں ——— میں ظاہر کرنے سے معذور ہوں کہ وہ اس کے متعلق کیا خیالات باندھا کرتا تھا۔ اور وہ محض خیالات ہی تھے یا اُن کے اندر وجدانات کے انجرات بھی شامل تھے؟ نجمہ بھی نعمانی کی معیت سے بہت خوش تھی، بالکل اسی طرح جس طرح معصوم بچے خوبصورت کھلونوں سے خوش ہوا کرتے ہیں وہ کتاب پڑھتا رہتا تو نجمہ چپکے سے اس کی گردن میں چٹکی لے کر بھاگ جاتی، وہ حیرت سے اس کی اِن بیباک حرکات کو دیکھتا پھر کسی شک کے ساتھ اسکے

چہرے کو گھورنے لگتا جس کی جلد کے نیچے وہی طفلانہ شوخی کی جھلک موجزن نظر آتی، چند منٹ بعد آخر وہ اپنے استکراہ و ناگوار قیاس کی تردید کر دیتا اور ملائم لہجہ میں اُس کو سمجھاتا "نجمہ ذرا خود آگاہی اختیار کرو، اب تمہاری عمر کے یہ بچھورپن شایاں نہیں رہا" پہلے تو وہ اِن فقروں پر دھیان نہیں دیتی تھی، لیکن جب متعدد بار یہی الفاظ نعمانی کے منہ سے اس نے سُنے تو اس کی سادہ روح کے اندر "آگاہی" کی حسیات نے کروٹ لی۔ وہ سوچنے لگی کہ نعمانی احسان صاحب سے جن کے سینہ پر وہ اکثر لاڈ سے پڑی رہا کرتی تھی بالکل مختلف حیثیت رکھتا ہے اور شاید ہر غیر مرد اُس کے والد سے اسی طرح جُداگانہ حیثیت رکھتا ہے، اُن تصوّرات یا بیداری خیال کے بعد اس کو نعمانی کے ساتھ اپنی پچھلی بے تکلفانہ حرکات پر خود بخود ایک قسم کی شرم سی محسوس ہونے لگی۔ بس یہ حیا، یہ حجاب ہی مقدمۃ الجیش ہے شباب کا!

نعمانی کے قیام کو دوسرا ہفتہ لگ گیا تھا۔ عید کی شام کو احسان صاحب نے یہ طے کیا کہ رات کا کھانا کھیت کی کھُلی ہوئی اور تازہ ہوا میں کھایا جائے چنانچہ جھٹپٹے کے وقت تینوں جنگل کی راہ سے کھیت کی طرف چل دیئے۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اسی طرف اُن کو جاتے ہوئے مسٹر فیض (پادری صاحب) اور مِس فیض بھی مِل گئے، مسٹر فیض احسان صاحب کے پاس اکثر آیا کرتے (نجمہ کو شروع میں انھوں نے ہی پڑھایا تھا) اور اسلام کی صداقت کو (جو اُن کے دِل میں کبھی کبھی کوندنے لگتی تھی) بصورت

اِعتراضات پیش کرکے تسکین حاصل کرتے رہا کرتے تھے۔

احسان صاحب نے جو اُن کو دیکھا تو قریب پہنچکر سلام کیا اور پادری صاحب نے عید کی مبارک باد پیش کی۔ مِس فیض نے بھی اپنی مترنم آواز میں نجمہ کو تہنیت عید سُنائی، نعمانی ان اجنبیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا، احسان صاحب نے مسٹر فیض سے اُس کی تقریب کرائی۔ مِس فیض نے بھی بعد تعارف اپنا پنجۂ دلکش مصافحہ کے لئے بڑھایا جس کو ایک لمحی تذبذب کے بعد نعمانی نے اپنی اُنگلیوں سے مس کر دیا۔ معلوم نہیں مصافحہ کنندگان پر اس مس لطیف کے پیدا کردہ کس قسم کے اثرات طاری ہوئے۔ لیکن نجمہ کی حسین آنکھوں میں ایک اندوہگین بے رونقی اور اس کے بعد فوراً ہی اطمینان خفی کی ایک جھلک سی پیدا ہو گئی۔ یہ تغیرات اِس قدر سُرعت سے پیدا ہوئے اور مٹ گئے کہ وہ خود اپنی متغیر حالت کا اندازہ نہ کرسکی۔

" شاید آپ اپنے کھیت پر جا رہے ہیں؟ مسٹر فیض نے احسان صاحب سے دریافت کیا۔

" جی ہاں آپ نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا؟ " احسان صاحب بولے۔

" کیوں آج عید کی دعوت دیجئے گا؟ " مسٹر فیض نے مسکرا کر کہا۔

" ہم لوگ آج شام کا کھیت پر ہی کھائیں گے۔ آپ کے شریک طعام ہونے سے بڑی مسرت ہوگی " احسان صاحب نے کہا۔

"بجھے تو کوئی عذر نہیں" مسز فیض نے خوش ہو کر جواب دیا۔ "لوسیا کو راضی کرنا نجمہ کا کام ہے۔"

نجمہ لوسیا سے بے تکلف نہ تھی، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک اجنبی عورت سے دعوت قبول کرانے کی ذمہ داری آخر اس پر کیوں عائد کیجا رہی ہے۔ پادری صاحب کچھ اور گوہر افشانی فرمانے والے تھے لیکن مس فیض جو نجمہ کی محجوب اداؤں اور نعمانی کے پر استغنیٰ اطوار کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ تبسم شیریں سے گویا ہوئی "ہاں نجمہ بی اگر ہم کو دعوت دیں تو ہم بخوشی قبول کرلیں گے۔"

"بجھے ——— میں ——— مجھے تو بڑی مسرت ہوگی آپ کی شرکت سے" نجمہ نے شرمسارانہ کہا۔

"خواہ میں بغیر آپ کے مدعو کئے ہی شرکت کرلوں" حُسن بیباک نے حُسن محجوب سے دریافت کیا۔

نجمہ جزبز تو نہیں ہوئی لیکن کوئی معقول فقرہ تلاش کرنے لگی۔ نعمانی نے اس کی کشمکش کو اس فقرے سے ہٹادیا" یہ آپ کا بہت ہی بے تکلفانہ رویہ ہوگا اور بے تکلفی وفور محبت کی دلیل ہے۔"

ہلال عید اپنی ناتوان زندگی کا ایک دن ختم کر کے رخصت ہو رہا تھا تھوڑی دور چلنے کے بعد کھیت آگیا۔ کنوئیں کے قریب ایک وسیع چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر پیشتر ہی سے قالین بچھادیا گیا تھا۔ احسان صاحب نے اپنے مہمانوں کو بٹھایا اور خود کھانے کا اہتمام کرنے چلے گئے۔

قریب کے باغیچہ سے ہوا کے فرحت ناک جھونکے جن میں گلوں کی نکہت اور خود رَو پودوں کی بھینی بھینی بو نے ایک خوشگوار مہک پیدا کر دی تھی، آ آکر مہمانوں کو نوازنے لگے۔ مس فیض کے عشق آشنا جذبات میں سرور کی ایک لہر پیدا ہو گئی، اُس نے ایک نشاط کی انگڑائی لی، اور کیف کی خفیف سی جھرجھری کے ساتھ نجمہ سے بولی " آؤ باغیچہ کی ہوا کھائیں "

اگر آپ پروانہ کو پھانسنا چاہیں (خواہ تفریح کی خاطر خواہ اُس کو تباہ کرنے کے لئے) تو کیا تدبیر کیجئے گا؟ بس شمع کو گردش دیدیجئے۔ جہاں بھی اس کو آپ لیجائیں گے پروانے صاحب خود بخود کھنچے چلے آئیں گے۔ یہی تدبیر مس فیض نے اختیار کی۔ اس کو خیال ہوا کہ نجمہ کو ساتھ لے لینے سے جناب نعمانی خود کھنچے چلے آئیں گے ——— وہ اپنے اِس قیاس میں ایک حد تک حق بجانب تھی، کیا وہ اپنے دیرینہ تجربات کی بنا پر یہ قیاس آرائی نہیں کر سکتی تھی کہ دو نوجوان دل باہم رہیں اور ان میں پریمی کیفیات اور حصولِ لذت کی تمنائیں پیدا نہ ہوں، لیکن جب " گل محمد " قسم کے نعمانی میں " زمیں جنبد " کے باوجود کوئی جنبش نہ ہوئی تو مس فیض کو اپنے قیاس کی غلطی کا احساس ہوا۔ اس احساس سے اس کو ایک نئی آرزو کا موقع مل گیا اُس نے آزادِ عشق نعمانی کو اپنی تکمیل خواہشات کے لئے جیت لینے کی توقعات باندھنی شروع کر دیں۔

" آپ بھی چلیئے مسٹر نعمانی " اس نے اپنی تمام وَالہانہ اَدائیں صرف کرکے

آخر کہا: "پاپا آپ بھی چلیں گے کیا؟" ظاہر بیچارے پاپا سے لفظ "بھی" کے ساتھ سوال کرنے کا مقصد یہی تھا کہ اُن کی معیت کی ضرورت نہیں سمجھی جا رہی تھی، چنانچہ سمجھ دار پاپا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر آئیے نا، آپ تو ہلتے ہی نہیں" میں نے اس قدر سفاکی سے کہا۔ نجمہ بھی نعمانی کی جانب سادہ مگر "تادیب طلب" نگاہوں سے دیکھ رہی تھی:

"چچا میاں کو بھی آجانے دیجئے، تاکہ اس متبرک بوڑھے پادری کو اپنے ہم عمر بزرگ کے ساتھ چلنے کا موقع مل جائے۔"

نعمانی نے مسکرا کر مشرقی بزرگ کے انداز میں کہا، مس فیض نے جسکی نگاہ تلطف کی حسرت میں بہت سے نوجوان جی رہے تھے اپنے نسوانی الطاف اُس شخص پر بے اثر دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور کبھی شک کے ساتھ یہ قیاس قائم کیا کہ نعمانی یا تو پہلے سے کسی بہت حسین عورت پر عاشق ہے (شاید وہ نجمہ نہ ہو) یا اس کو اپنی قابلیت کا غرہ ہے، اِس تکلیف دہ خیال سے اس کے پندار میں متعدد شگاف ہو گئے۔ مسٹر فیض بھی اپنی بیٹی کے صدمہ سے بیخبر نہ تھے۔ اُن کی بھی حمیّت باختہ طبیعت پر بڑا اثر ہوا۔

نجمہ کے بیحس و معصوم دماغ میں نعمانی نے اپنی گونہ گونہ حرکات وافعال سے بیداری کی شعاعیں پیدا کر دی تھیں۔ چنانچہ وہ اب واقعاتِ زندگی پر غور کرنے کی عادی ہو چکی تھی! اس کے ننھے سے دِل میں دفعتہً ایک خیالِ خلش زنی کرنے لگا، معاً کسی واقعہ کی یاد سے اُس کو تکلیف ہونے لگی

وہ اپنی طفلانہ شوخیوں کی بنا پر جب نعمانی کو چھیڑ کر بھاگ جاتی تھی تو اُس وقت بھی وہ اس کو اسی روکھے پن سے باز رکھا کرتا تھا، جس طرح اس وقت مس فیض کی دعوت تفریح کو اُس نے ٹھکرا یا ہے۔ خیر یہ تو اچھا ہوا لیکن کیا اس کی سرد مہری کی شکار وہ بھی تھی۔ کیا وہ اس کو اور مس فیض کو یکساں ہی سمجھتا ہے؟ کیا وہ بھی مس فیض کی طرح اس کی نگاہوں میں غیر قابل اعتناٗ ہے آہ! کیسا روح فرسا خیال تھا۔ اس کے نازک دل سے ایک مدہم سی آہ نکلی، اس کے معصوم سینے میں ان اندوہگیں شکوک نے تلاطم پیدا کر دیا اسکی دلکش آنکھوں سے خون جگر قطراتِ اَشک کی شکل میں بہنے لگا۔ دفعتہً وہ اپنے خیالات سے چونکی اور گھبرا کر نعمانی کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اس کی اِس بیچین حرکت کو دیکھا۔ ہائیں وہ رو رہی تھی —— نجمہ رو رہی تھی۔

چند منٹ بعد دسترخوان آگیا اور سب کھانے میں مصروف ہو گئے لیکن دو نسوانی دل بالکل علیحدہ علیحدہ اپنی وجوہاتِ ناکامی پر پژمردہ تھے مس فیض کا اقدامِ تعشق باحیا نجمہ کی سوز باطنی کی تحریک کا باعث ہوا، اگر لوسیا اس وقت نعمانی پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرتی تو شاید نجمہ ابھی ایک طویل مدت تک رقابت، رشک، اور خلش محبت سے نا آشنا رہتی۔ یہ بالکل نفسیات محبت کے قرین اَمر تھا کہ لوسیا کی نعمانی پر عاشقانہ دسترس نے نجمہ کی اس موہوم دلچسپی، اور غیر واضح لگاؤ کی جو چند روز سے اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا وضاحت کر دی، اس کو معلوم ہونے لگا کہ نعمانی کا خیال جو اُس کی روح پر پہلے

ایک ہلکی حرارت کی طرح مسلط ہوا تھا اب ایک تند بخار کی شکل میں اس کو پھونک رہا ہے، کھانے سے فارغ ہو کر احسان صاحب اپنے مہمانوں کو لیکر باغیچہ میں گئے۔ نکہت بار پھولوں کے درمیان سرسبز تختہ پر پانچ آرام کرسیاں پڑی تھیں اور ایک چھوٹی سی سادہ میز۔

"آؤ نجمہ بی۔ باغ کی سیر کریں۔ کھانا کھا کر ٹہلنا ضرور چاہیئے" مس فیض نے نجمہ سے کہا۔

"دیکھو ادھر کنوئیں کی طرف مت جانا" احسان صاحب نے کہا۔ نجمہ نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ نعمانی پر ڈالی۔ اور لوسیا نے بھی اس توقع کے ساتھ کہ وہ اس کے بشرہ پر "از رُوئے معیت" کے آثار پڑھ سکے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ ایک انداز استغنیٰ سے انگلیاں بیٹھا ہوا چٹخاتا رہا۔ آخر وہ دونوں باغ میں چلی گئیں۔

"پردہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے مسٹر نعمانی"؟ مسٹر فیض نے ایک غیر متوقع سوال کھینچ مارا۔

"ہونا چاہیئے" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرے خیال میں تو نہیں ہونا چاہیئے" پادری صاحب بولے۔

"میرے خیال میں ہونا چاہیئے" نعمانی نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں ہونا چاہیئے"؟ مسٹر فیض نے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں ہونا چاہیئے"؟ نعمانی نے کہا۔

"پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیجئے" پادری صاحب نے اِصرار سے کہا۔

"پردہ کی مخالفت کی ابتدا، چونکہ پہلے آپ کی جانب سے ہوئی ہے لہذا اپنے قول کے ثبوت کا بار آپ پر عائد ہوتا ہے" نعمانی نے کہا۔

"پردہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ سمِ قاتل ہے، مضرِ صحت ہے، مانعِ آزادی ہے اور حائلِ مسرّت ہے" پادری صاحب نے گالیوں کے مترادف ان الفاظ کو اِستعمال کر کے کہا۔

"ہونا چاہیئے کیونکہ وہ نگہبانِ عصمت ہے، محافظِ ناموس ہے، قاطعِ سیاۃ ہے اور باعثِ سکون ہے" نعمانی نے لفظی بحث کا لفظوں سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فیض، نعمانی کوئی طفلِ مکتب نہیں ہے، میرا بھتیجا بفضلا ایک مفکر و صاحب فہم اِنسان ہے۔ کیجئے بحث ہاں۔ آپ کیجئے بحث اس سے۔ ابھی آپ کو اس کی قابلیت کا اندازہ ہو جائیگا" اِحسان صاحب نے فخر کے طور پر کہا۔

"دیکھو عزیز بھتیجے!" مسٹر فیض سنبھلکر بولے "مرد و عورت جبکہ ایک مقصدِ حیات، یکساں طبائع و خیالات، ایک سی حسیات رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ مرد تو ہر طرح آزاد زندگی گزاریں اور اُناث کو اس طرح چھپا کر رکھا جائے۔"

"پادری صاحب جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وجودِ شیطان کی طرح صحیح سہی

لیکن مجھے یہ سُن کر بیحد افسوس ہے کہ آپ مرد و عورت کے مقصد حیات و نصب العین کو یکساں سمجھتے ہیں۔ بتائیے آپ بکری سے ہل کیوں نہیں چلواتے، بیل صاحب میں آپ کو کیا خصوصیت نظر آئی کہ آپ نے اس کو زراعت کے لئے منتخب کر لیا اور بکری میں کیا کمی نظر آئی کہ اس کی فلاحی خدمات کو مسترد کر دیا۔ نعمانی نے کہا۔

"اس کا میری بحث سے کیا تعلق ہے؟" پادری صاحب نے حیرت سے پُوچھا۔

"اِس گزارش کا مقصد یہ ہے کہ مرد و عورت بھی بالکل علیحدہ علیحدہ اپنا نصب العین رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

"اس طول کلامی سے کیا فائدہ" مسٹر فیض نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔" میری بات کا جواب دو۔ عورت کو پردہ میں بٹھانے سے کیا فائدہ جب کہ اس کی جانب سے ہر طرح اُس کے چال چلن کے متعلق اطمینان ہو"

معلوم ہوتا ہے کہ آپ جاہلانہ جوابات سے مطمئن ہونیوالی ذہنیت رکھتے ہیں، میں عالمانہ طور پر ایک بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہتا تھا خیر سنیئے۔

آپ عورت کے چال چلن کی غیر محدود وسعتِ معنی پر غور کیجئے۔ نہیں سمجھے آپ، اچھا میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ اپنے گھڑی کے شیشہ، اپنے کانچ کے برتنوں وغیرہ کی کیوں حفاظت کرتے ہیں۔ جب کہ آپ کو یقین ہے کہ وہ اپنی ذات میں کافی مضبوط ہیں"

"سبحان اللہ! کیا منطق ہے بیٹے تمہاری" احسان صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کا کیا مطلب؟ اس کے کیا معنی"؟ پادری صاحب نے کسی قدر سراسیمگی سے کہا "کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ عورت اور ظروف شیشہ میں باہمی مماثلت ہے؟" جبھی سے ہم نے دل دیا

"بہت بڑی حد تک۔ اس کے علاوہ میں آپ کے ذہن میں ایک اور مردہ حقیقت کو زندہ کر دینا چاہتا ہوں۔ عورت اور ظروف شیشہ کی نزاکت کو یہیں چھوڑ یئے۔ ان کے محافظ (مرد) کی نفسیاتِ حزم و تحفظ کا جائزہ لیجئے! شیشہ کی حفاظت کا خیال انسان کے دل میں کیوں پیدا ہوا؟ اس کی نزاکت کو دیکھ کر اور اس سے سخت تر اشیاء کے وجود کے باعث۔ حالانکہ نہ تو بلا کسی تہیج کے شیشہ کو کوئی گزند پہنچ سکتی ہے، نہ اس سے سخت اشیاء بلا علت اس سے متصادم ہو سکتی ہیں لیکن "خیال تحفظ" ہی ایک ایسا آلہ ہے جس کی بناء پر کمزور شئے کی حفاظت ہوتی رہتی ہے۔ صاحب فہم و دور بین ہوتے ــــــ"

دفعتہً ایک ہلکی اور ایک ذرا بلند چیخ کی آواز آئی۔ جس سے تینوں چونک اٹھے، احسان صاحب گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور نعمانی بے تحاشا آواز کی جانب دوڑا۔ پادری صاحب نے بھی اطمینان سے اپنے جوتے میں سے کنکر نکالے اور اس کو پیر میں ڈال کر منہ اٹھائے احسان صاحب کے پیچھے پیچھے چلے۔

نعمانی نے تقریباً پچاس قدم کے فاصلہ پر خشک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ

سنی گویا کوئی کشتم کشتا ہو رہی ہے۔ ماہ نو پہاڑی دیوار کے پیچھے جست کرنیوالا تھا اُس کی کمزور شعاعیں اشیاء کو روشن کرنے میں بالکل ناکام تھیں۔ معاً ایک تناور درخت کے سایہ میں نعمانی نے چار متحرک انسانی قد دیکھے۔ وہ تیزی سے اسی طرف مُڑا اس کے پیروں کی آواز سن کر ایک دبی ہوئی امداد طلب چیخ پھر نکلی۔ نعمانی موقع واردات پر پہنچ گیا، دیکھا کہ نجمہ کو ایک قوی ہیکل انسان نے گود میں اُٹھا رکھا ہے، اور روز آنہ تازہ ہوا میں ٹینس، بیڈ مِن وغیرہ کھیلنے والی خاتون بھی ایک اور مرد کے بازوئیں اس طرح پھڑ پھڑا رہی ہے، جیسے شہباز کے پنجہ میں کنجشک، نعمانی کو دیکھکر ان لوگوں نے اپنے دبوچے ہوئے شکار کو لے کر چمپت ہونا چاہا۔ لیکن ان میں سے ایک شخص کی ٹانگ احاطہ کے تار میں اُلجھ گئی اور وہ سخت دھما کے کے ساتھ مُنہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے گرتے ہی لوسیا سہمی ہوئی فاختہ کی طرح وہیں زمین پر پڑی رہ گئی۔ نجمہ کا حامِل اِنسان تار کو کامیابی سے کودا تھا لیکن فرار ہونے سے قبل اس کو نعمانی نے جالیا۔ گردن پر ایک گھونسہ کی ضرب سے وہ سنبھلا، نجمہ بجلی کی طرح اس کی گود میں تڑپی، نیتجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اوندھے منہ زمین پر آرہا، اس اثناء میں پہلا بدمعاش فرار ہو گیا۔ نعمانی نے مغلوب حریف کو کس دیا اور خائف نجمہ کو سنبھال کر لوسیا کی طرف بڑھا۔ احسان صاحب اور مسٹر فیض بھی آپہنچے تھے اور نعمانی کی کامیابی کو پھر از سر نو جوان ہو جانے کی حسرت سے دیکھ رہے تھے۔

تمام معاملہ جلد رفع دفع ہو گیا، مسٹر فیض اور احسان صاحب پھر

اپنی اپنی جگہ پر آ بیٹھے۔ نعمانی نجمہ اور لوسیا کی طبیعت سے دہشت کے اثرات زائل کرنے کی غرض سے ایک روش پر رُک گیا۔ " مسٹر نعمانی آپ کا یہ زبردست احسان تاقیامت مجھے یاد رہے گا۔" مس فیض نے اس کے بازو سے تقریباً لپٹتے ہوئے کہا۔

" اچھا لیکن آپ اُنکے شانہ پر سے تو ہاتھ ہٹائیے۔" نو آموزِ محبت نجمہ نے رُکتے رُکتے کہا۔ مس فیض کسی قدر خفیف ہو گئی، یہ نجمہ کی پہلی رقیبانہ شرارت تھی۔

" تین گھنٹے سے آپ کی تعریف کے گیت گائے جا رہی ہیں یہ" نجمہ نے لوسیا کو اور زیادہ جھپانے کی غرض سے کہا۔

" حالانکہ میں سراپا عیب ہوں۔ اور تم بھی مجھے پُر معائب سمجھتی ہو" نعمانی نے خاص نگاہوں سے نجمہ کو دیکھکر کہا۔

" نہیں تو ——— میں آپ کو کیوں سمجھنے لگی پر معائب" اس نے کسی قدر شرما کر کہا۔

" پھر یہ بات کہنے کی کیا ضرورت تھی" مس فیض نے نجمہ کو مزید شکست دینے کو کہا۔ " مسٹر نعمانی! یہ ——— یہ پھول ——— یہ لطیف پھول اعترافِ ممنونیت کے طور پر میرے حقیر ہاتھوں سے قبول کیجئے۔" اُس نے ایک تازہ پھول توڑ کر نعمانی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

" لائیے" نعمانی نے اس کو لیتے ہوئے کہا۔

" نجمہ تم میری سرفروشی کے اعتراف میں کیا شے پیش کرتی ہو؟"

اُس نے نجمہ کی طرف دیکھ کر دریافت کیا جس کی آنکھیں اِستکراہ وحقارت سے لوسیا کی جانب نگراں تھیں۔ اس سوال سے دفعتہً ان میں مزید چمک پیدا ہو گئی۔ اُس نے خود کو ذرا روکا اور اپنی پتلی انگلیوں سے سبز گھاس کی نازک پتیاں نُوچتے ہوئے حیا آگیں لہجہ میں کہا " پھول مل جانے کے بعد آپ کو پھر کس شئے کی تمنا رہ سکتی ہے "۔

" ارے ایسا عاقلانہ جواب! جو جواب بھی ہے اور طنز بھی" نعمانی نے اس غیر متوقع تغیر پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے کہا " تو تم مجھے اپنی جانب سے کوئی چیز پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتی ہو؟" نعمانی نے زمین پر جھکی ہوئی دلفریب آنکھوں کو دلچسپی سے گھور کر دریافت کیا اس کے جواب میں نجمہ نے بیچینی سے نشست بدلی اور بآہستگی اٹھ کر چلدی۔

" مغرور کہیں کی" نعمانی نے زیرِلب کہا " بھول گئی وہ وقت جب کہ میرے سینہ پر کودپڑا کرتی تھی۔ اب احساسِ شباب ہوتے ہی یہ رکھ رکھاؤ، یہ ناز پیدا ہو گیا عورت کی یہی ادائیں دنیا میں اصنام پرستی کی تبلیغ کرتی ہیں"۔ لوسیا بھی تو ایک عورت تھی اور دلفریبی میں نجمہ سے کسی طرح کم نہ تھی، بلکہ اس سے ایک صفت دلنوازی میں بڑھی ہوئی تھی نعمانی کیا اس سے محبت نہیں کر سکتا تھا؟ کیوں نہیں سکتا تھا۔ اگر محبت محض ایک لذت خیز مشغلہ ہے تو اس کے لئے نعمانی کو لوسیا سے بہتر کوئی محبوب نہیں مِل سکتا تھا، اور اگر محبت نام نہیں جذباتی مبادلہ کا، شاعری

لین دین کا بلکہ یہ ایک سرورِ تلخ ہے، ایک وجدانِ عبوس ہے، ایک غیرارضی شئے ہے۔ تو نعمانی کو وہ ذرا دشواری سے ملے گی۔

تخلیہ ہوتے ہی مس فیض نے حجاب کی باگ کو اور ذرا ڈھیلا کر دیا نعمانی کے قریب آ بیٹھی اور اس کے فاؤنٹین پن کلیپ سے کھیلنے لگی۔

"مس فیض تم بہت اچھی لڑکی ہو۔ خوبصورت بھی اور خوب ....
اس نے سیرت کے لئے رائے محفوظ رکھ کر جملہ ناتمام چھوڑ دیا۔

"پھر آپ کو اس سے کیا"؟ اس نے حجاب پر مسرت کو غالب کرتے ہوئے دریافت کیا۔ گلاب کے پودوں کی چند بلند ٹہنیاں خفیف سی متحرک ہوئیں اور ان میں سے دو آشفتہ آنکھیں مسرور جوڑے کو دیکھنے لگیں۔

"تم کس خوش نصیب کو اپنا شوہر بننے کی مسرت بخشو گی؟" نعمانی نے دریافت کیا۔

"آپ کے اِس بے تکلفانہ سوال کا مقصد کیا ہے"؟ اِقدام محبت کی خوگر عورت نے دریافت کیا۔ پھر چند لمحہ کے توقف کے بعد مسکرا کر بولی "اگر ہم کسی سے منسوب ہو جائیں تو کیا آپ کو اِس کا رنج ہوگا"؟

"رنج و غم سے تو بندہ متاثر ہوتا نہیں ہے"۔ نعمانی کی فلسفہ آشنا زبان سے الفاظ نکلے۔ گلاب کی ٹہنیوں کو پھر خفیف سی حرکت ہوئی "یہ آپ بنتے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ جو شئے آپ کی مرغوب طبع ہو

وہ کسی اور شخص کے قبضہ میں چلی جائے۔ کیا آپ اس پر متاسف نہ ہوں گے؟" ٹہنیاں باہم پیوست ہوگئیں لیکن چند سکنڈ بعد پھر ان میں خلا پیدا ہوگیا۔

"مرغوب بلیع" نعمانی نے ایک انداز استہزا سے کہا: "پہلے کوئی شئے مرغوب بلیع تو ثابت ہولے"

"کیا معنی"؟ مس فیض نے ہزیمت خوردہ پرند کی طرح جسم پھیلاتے ہوئے کہا: "نعمانی؟ اچھے نعمانی! کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم کو مجھ سے —— آہ میری زندگی مت غارت کرو"

"مس فیض۔ ہوش میں ہو کچھ! میں تم کو صرف چند گھنٹوں سے جانتا ہوں" .... نعمانی نے سکون کے ساتھ کہا۔

"نعمانی" لوسیا نے اس کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "نعمانی میں تم کو چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے محبت ہے"

"چاہے جاؤ مجھے۔ لیکن تم میری چاہت میں خوش نہیں رہ سکتی ہو۔ اس میں تم کو تمام عمر گوناگوں مصائب میں مبتلا رہنا پڑے گا؟"

"کیوں؟ کس طرح؟؟" لوسیا نے کیقدر اپنے جذبات پر قابو پاکر دریافت کیا۔

"کیوں کہ میں ایک نہایت ہی خودغرض انسان ہوں۔ اس کے علاوہ میں عورت کو نہایت حقیر جنس سمجھنے کا عادی ہوں، اس کے جذبات

کا میں مطلق احترام نہیں کرتا" نعمانی نے نہایت خشک لہجہ میں کہا۔

"کیا تم یہ سنجیدگی سے کہہ رہے ہو"؟ محبت کے جذبات مس فیض کے دل سے تقریباً ہٹ چکے تھے، شاخہائے گل میں پھر ایک تلاطم سا پیدا ہوگیا۔

"نہایت سنجیدگی سے۔ علاوہ ازیں" نعمانی نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا" میں بہت ہی قلیل المعاش انسان ہو۔ میری ہونیوالی شریک زندگی کو ایک اذیت دہ عسرت سے میرے ساتھ دن گذارنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے"

" نعمانی یہ بڑا دحشت انگیز انکشاف ہے" مس فیض نے اُس کے پاس سے کھسکتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور شاید قاطع محبت بھی۔ لوسیا کیا تم مجھ سے اَب بھی محبت کرتی ہو؟ مجھ جیسے انسان سے جو کنگال تو علیحدہ ہے اور بہیمیت پسند علیحدہ" نعمانی نے تلخ تبسم کے ساتھ پوچھا۔ مس فیض نے افسردہ لہجہ میں کہا" نعمانی میں ایسے شخص سے آنکھ بند کر کے محبت نہیں کر سکتی"

"اِس کے یہ معنی ہیں کہ میں تم سے مایوس ہو کر خودکشی کر لوں" نعمانی نے غمگین آواز بنا کر کہا۔

"اس سے کیا فائدہ۔ اپنی جان سے جاؤ گے" لوسیا نے خشک جواب دیا۔

"اچھا جو کچھ کہہ رہی ہو اُس کو یاد رکھنا" نعمانی نے مصنوعی غصہ سے

کہتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ گلاب کی ٹہنیاں اب بالکل پیوست ہو گئیں اور اُن میں بار دیگر پھر کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

نعمانی اپنی کورٹ شپ کی ناکامی پر اور مس فیض اپنے غلط انتخاب پر غمگین صورت بنائے اپنے ساتھیوں سے آملے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی تیار کی گئی اور احسان صاحب مع اپنے مہمانوں کے قصبہ کی طرف روانہ ہوئے۔

نعمانی کی تعطیلات اب قریب الاختتام تھیں، اس کا رنج وہ احساس نجمہ کو بھی تھا۔ محبت مسترد ہو جانے کے بعد نعمانی لازماً مغموم نظر آتا۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ وہ اب بھی اسیقدر بشاش تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے فلسفۂ غم و مسرت کو نباہ رہا ہو۔

"نعمانی اب تم زیادہ تعلیم حاصل کر کے کیا کرو گے۔ اس زمینداری کو کیوں نہیں سنبھالتے ہو کیا یہ تمام جھنجھٹ اپنے ساتھ قبر میں لیجاؤں گا؟" ایک دن احسان صاحب نے جوش محبت سے نعمانی کو مخاطب کر کے کہا۔ ان کو نعمانی سے اگرچہ پہلے زیادہ اُنس نہ تھا لیکن اس بار وہ نہ معلوم کیوں اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ اُسے جدا کرنے کو ان کا جی نہ چاہتا تھا۔ نعمانی کی آنکھوں میں شکریہ کے آنسو امنڈ آئے اور نجمہ کی حسین آنکھوں میں مسرت کی چمک پیدا ہو گئی۔ احسان صاحب پھر بولے "تم بفضلہ اور نوجوانوں سے بالکل علیحدہ اپنا سطح نظر رکھتے ہو۔ فلاحت و زراعت کو ملازمت سے پست نہیں سمجھتے۔ کیا سمجھتے ہو؟"

"نہیں چچا میاں میں ملازمت پر اس کو ہزار بار ترجیح دیتا ہوں"

نعمانی نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد احسان صاحب زمین کی دیکھ بھال کے لئے چلدیئے نعمانی بھی تفریح کے لئے باہر نکل گیا۔ وہ اپنے چچا کی عدم موجودگی میں زنان خانہ میں نہیں جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نجمہ سے ملاقات کئے اسے کئی کئی روز گزر جایا کرتے تھے۔

ایک دن شام کو غسل خانہ سے نکل کر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ احسان صاحب کی والدہ نے (اس کی دادی کہیئے) آواز دے کر اس کو اندر بلایا اور بولیں "کیا بیٹا تم کل ہی جا رہے ہو؟"

"جی ہاں۔ اب چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں" نجمہ اپنے کمرے میں تھی اس کی آواز صحن میں سن کر باہر آگئی اور خاموشی سے دادی کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ گئی "اللہ تمہارے علم میں برکت دے۔ خوب پڑھے جاؤ بھیا۔ تم کو ہی راحت ملیگی۔ نماز بھی پڑھا کرتے ہو بیٹے"؟

"پڑھتے تو ہیں لیکن دو وقت کی" نجمہ نے شریک کلام ہونیکی نیت سے آہستہ سے کہا۔

"جی نہیں پانچوں وقت جبین سائی کرتا ہوں۔ میرا کوئی اصول ناقص نہیں ہے۔ خواہ وہ ثواب سے متعلق ہو . . . . "خواہ عذاب سے" نجمہ نے جملہ ناتمام کر کے کہا۔

"نہیں عذاب کے لئے تو بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہے" نعمانی بولا۔

"کیا دل آزاری گناہ نہیں ہے؟" نجمہ نے کہا۔

"دل آزاری؟" نعمانی نے حیرت سے دریافت کیا۔

"آپ جا کیوں رہے ہیں؟ آپ نے آپا کی تجویز پر غور نہیں کیا؟" اس نے نعمانی کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔

دادی اماں ہنڈیا سنبھالنے چلی گئی تھیں۔ نعمانی نے نجمہ کے پنجۂ حنائی پر اپنی مردانہ ہتھیلی کا قابلِ تحمل زور دیکر پھر دریافت کیا "پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ کونسی دل آزاری ہوئی مجھ سے اور کس کی؟" نجمہ کا نازک ہاتھ آزاد ہونے کی سعی ناکام میں وہیں کسمسا کر رہ گیا۔ نعمانی نے اِس سرور آگیں مس سے لطف اندوز ہو کر پھر کہا۔

نجمہ تم بہت باتیں بنانا سیکھ گئی ہو۔ اچھا کئے جاؤ میری مذمت۔ لیکن مجھے تم سے اس قسم کے سوءِ ظن کی توقع نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ تمہارا دل بھی اسقدر صاف و بے عیب ہے جس قدر تمہاری صورت۔" یہ اپنی نوعیت کے بالکل پہلے الفاظ تھے جن کو نعمانی کسی مبہم تاثر سے مغلوب ہو کر ادا کر رہا ہے، وہ اس سے پیشتر بھی ایک عورت سے رومانیت انگیز مقام پر گفتگو کر چکا تھا۔ اور موضوع دونوں کا یکساں تھا۔ مگر اس وقت وہ سوزِ مجسم نظر آ رہا تھا اور اور گذشتہ موقع پر سرد روں!

"میں نے کونسی مذمت کی آپ کی؟" نجمہ نے نعمانی کی قوی ہتیلی کے نیچے سے اپنا ہاتھ رہا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ مذمت نہیں تو اور کیا ہے کہ دادی اماں کے سامنے تم نے مجھے دل آزار اور نہ معلوم کیا کیا بنا ڈالا" نعمانی نے دبے ہوئے نازک

ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"پھر اس میں جھوٹ کیا ہے؟" نجمہ بولی۔ دفعتہً دادی اماں آتی نظر آئیں تو نعمانی ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

"پھر کل کس وقت جاؤ گے تم؟" بڑی بی نے دریافت کیا۔

"علی الصبح لاری یہاں سے جاتی ہے۔ بس اسی سے چل دونگا۔"

"کیا دن میں اور کسی وقت نہیں جاتی ہے" نجمہ نے نا معلوم کس خیال سے دریافت کیا۔

"نہ" نعمانی بولا "نجمہ تمہیں تکلیف تو ہوگی میری ایک دو کتابیں جو تمہارے پاس ہیں لا دو۔

"کیا رسالے بھی؟ نجمہ نے دریافت کیا"

نہیں اُن کو تمہاری دلچسپی کے لئے چھوڑے جاتا ہوں" چند منٹ باتیں کر کے نعمانی یہاں سے رخصت ہوا اور صبح جبکہ نجمہ اپنے خواب شیریں سے لطف اندوز تھی وہ اس کی خوابگاہ نازکی طرف حسرت آگین نظر ڈال کر علی گڈھ روانہ ہو گیا۔

مجھے اب تک نعمانی کے پاس آئے ہوئے لفافوں کا راز معلوم کرنے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ جب معلوم ہوا کہ وہ تعطیلات ختم کر کے آگیا ہے تو ایک دن پھر جا کر بلائے بے درمان کی طرح اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ غریب نعمانی نے تو پہلے ہی روز تمام لفافے میرے سامنے ڈال دیئے تھے وہ تو میری ہی فہم کا قصور رہے کہ اُن کا مضمون میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس روز اُس نے چند خاص لفافے

میرے سامنے ڈال دیئے لیکن ان میں بھی وہی کارنامہ ہونکی داستان تھی۔ ایک خط ایڈیٹر صاحب اخبار" خادم" کا بھی تھا۔ لکھتے ہیں "آپ کے اعلان کے جواب میں موصولہ مضامین ارسال خدمت ہیں۔ جناب انتخاب فرماکر خود فیصلہ فرمائیں ——" میں بیساختہ چونک اُٹھا اور بے اختیار بولا "نعمانی! انعامی اعلان سے تمہارا کیا تعلق؟ اس سے تمہیں کیا واسطہ؟ اور یہ کارکنندگان اپنے اپنے کارنامے تمہارے پاس کیوں روانہ کر رہے ہیں؟ بتاؤ بتاؤ خدا کے واسطے مجھے سمجھاؤ، اس کا کیا مطلب ہے؟"

"آپ اگر اب بھی کچھ نہ سمجھیں تو میں ایک پُردرد آہ کے ساتھ کہنے پر مجبور رہوں۔۔۔ چنیں عقل و دانش۔۔۔۔۔۔"

"بکومت جی! تمہیں اللہ کی قسم" میں نے خوشامدانہ لہجہ میں اس سے کہا۔

"تمہیں خدا کی قسم! کیا یہ اعلان تمہاری جانب سے تھا؟ کیا اتنی گران رقم تم نے وقف کی ہے خدمات عامّہ کے لئے؟"

"ہاں" نعمانی نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن تمہارے پاس اتنی رقم خطیر کہاں سے آئی؟" میں اسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"اب لگے نہ یہ ح و قدح کرنے۔ میں جانتا تھا کہ ایک بات لکھ کر کے مجھے سینکڑوں سوالات کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔ بات دراصل یہ ہے اس نے سنجیدگی سے کہا، کہ والد مرحوم نے تیس لاکھ روپیہ ترکہ میں چھوڑا ہے۔

اور وہ بلا شرکت غیرے میرے قبضہ میں آیا ...."

"مجھے خبر نہ تھی، مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس قدر دولت مند انسان ہو۔ نعمانی میں تم کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں ...."

"کیا والد بزرگ کی موت کی مبارکباد؟" اُس نے تلخ تبسم سے کہا۔ "قدیر میرے پدر محترم کی بیش بہا زندگی ان تیس لاکھ روپوں سے کہیں زیادہ قیمتی تھی (اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں) خیر ——— تو مجھے اس رقم خطیر کی کیا ضرورت ہے؟ میں ایک لاکھ روپیہ سے اپنی حیات کے دن بآسانی بسر کر سکتا ہوں۔ تمام رقم پر مار دفینہ بن کر بیٹھنے سے کیا فائدہ۔ کیوں نہ اس کو مستحقین پر صرف کروں۔ کیوں نہ اس روپے کو رفاہی کاموں کے لئے وقف کروں، ۲۹ لاکھ روپیہ سے اگر وسیع ہندوستان کے ایک کنج تاریک میں بھی اخوت، ایثار، اور کارکردگی کی لہر دوڑ جائے، اگر ایک قلیل جماعت کا تعطل بھی رفع ہو جائے تو میں سمجھونگا کہ ابا کی پاک کمائی اُن کی نجات اُخروی کے کام آئی۔"

"آفریں! صد آفریں!! میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا "خدا تم کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔ ہندوستان کے قارون صفت دولتمندوں میں تم پہلے حاتم ثانی پیدا ہوئے ہو۔ بھئی میں تو ان تمام باتوں کو شائع کراؤں گا۔ تاکہ اور اہل دول کو بھی تحریص و رغبت ہو۔ میرا سینہ جذبات احترام سے پھٹا جا رہا ہے۔ ادھر آؤ نعمانی ———" میں نے لپک کر اپنے دوست کو گلے لگایا چند منٹ بعد اخبار خادم کے صفحات کے لئے من و عن

واقعات چھپنے کو دیدیئے۔ دوسرے روز موٹے حروف میں میرے دوست کی زریں قربانی سے اخبار مذکور کے کالم روشن تھے۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چند ماہ بعد ہی ہندوستان کی طلائی فضا میں تلاطم مچ گیا۔ دولت کے وہ جوالا مکھی پربت جو مدتوں سے عالم جمود میں پڑے ہوئے تھے، اس ایک قربانی سے، اِس سنہری آگ سے مشتعل ہو کر نقرئی ——————— مادہ اگلنے لگے۔ صنعت کی راہیں کھل گئیں۔ تجارت سے لوگوں کو شغف ہونا شروع ہو گیا، اِنسان آپسمیں ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھنے لگے۔ اخوت و محبت کے دروازے کھل گئے، لیکن وہ نخود داجد، وہ بارش کا پہلا قطرہ، وہ سحاب فیض اب بھی کالج کی چہار دیواری میں بیٹھا ہوا ہزاروں امیدوں کی کھیتیوں کی آبیاری کر رہا تھا۔

نعمانی کو قصبہ سارن سے آئے ہوئے تقریباً چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اِس قلیل مدت میں صرف دو واقعات ایک اہم اور ایک غیر اہم رونما ہوئے پہلا واقعہ تو یہ کہ مسٹر فیض کا اِنتقال ہو گیا اور بے یار و مددگار! لوسیا کو مشن نے اس کی خواہش پر ایک میڈیکل اِسکول میں داخل کرا دیا۔ دوسرا واقعہ بظاہر بالکل سطحی تھا۔ لیکن نعمانی پر اس کا شدید اثر ہوا، وہ ایک روز اپنی درسی کتب دیکھ رہا تھا کہ ایک ورق کے حاشیہ پر زنانہ خط میں یہ سطر اس کی نظر سے گذری۔

"اپنے مفلوک الحال نعمانی کو میرا دِل
ہمیشہ یاد کرتا رہے گا"

اس کی مفلوک الحالی واقعہ کے خلاف تھی۔ وہ مفلوک الحال نہ تھا۔ پھر کسی کو اس قسم کا مغالطہ کیوں ہوا؟ دفعتہً اُسے یاد آگیا۔ ہاں اُس نے ایک بار لوسیا کی محبت آزمانے کے لئے اپنے کو نادار ظاہر کیا تھا اس کے علاوہ اس نے دنیا میں اور کسی کے آگے اپنے کو اس گری ہوئی حیثیت میں پیش نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ تو اس انکشاف پر اس کی محبت کو مسترد کر چکی تھی، پھر تیسرا شخص وہ کون ہو سکتا ہے جو اُس کے فریب عسرت کا شکار ہوتے ہوئے بھی اس کو یاد کرنے کا مدعی تھا؟ اس سوال کا جواب بہ ظاہر کچھ نہ تھا، اگر تھا تو قرین قیاس نظر نہ آتا تھا۔ ایک نجمہ کی طرف شک جاتا تھا لیکن وہ اس وقت موجود کب تھی، جب وہ اپنے کو مفلس ظاہر کر کے لوسیا کی تعیش طلب روح فتح کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اِس کے علاوہ ——— اِس کے علاوہ کیا نجمہ اس کو یاد کر سکتی تھی؟ کیا اس کے دِل میں نعمانی کا خیال ———

ہاں اس شخص کا خیال برقرار رہ سکتا تھا جس کی عسرت سے متکرہ ہو کر ایک عورت اس کو ٹھکرا چکی تھی؟ کیا دنیا میں کسی ایسی عورت کا وجود ہے جو اس کو قلاش سمجھتی ہوئی بھی اُس کے تمغۂ محبت کو قبول کر کے حقیقی ایثار حقیقی اِحتشامِ محبت کا ثبوت دے سکتی تھی؟ اللہ! یہ دنیا بھی کس قدر مختلف الطبع لوگوں سے پڑ ہے!!

چار سال میں نعمانی نے ایم۔ اے کر لیا اور اُدھر چار سال میں لوسیا بھی لیڈی ڈاکٹر بن گئی۔ اس کی نظر سے بھی نعمانی کے پیش کردہ اِعلان اور اُس پر مختلف رسائل کی تحسین و تہنیت گذر چکی تھی۔ اَب اُس کا علم تو خدا ہی کو

کو خوب ہے کہ نعمانی کے "حُسن فریب" اور اپنی "سوء اعمالی" سے اس افشائے راز کے بعد اس کو کس قدر صدمہ ہوا۔ آہ نعمانی جیسا عالی حوصلہ شخص اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

ادھر احسان صاحب اور نجمہ بھی اس حقیقت کے افشاء پر بہت متحیر و مسرور تھے۔ احسان صاحب کو صرف اتنا علم تھا کہ نعمانی کے والد نے اس کے لئے ترکہ میں کچھ روپیہ چھوڑا ہے، لیکن اس قدر گراں رقم ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔ نجمہ اس کی شہرت سے مسرور تھی لیکن ثروت سے مغموم۔ کیا ایسا شخص اب اس کو یاد کرسکتا تھا؟ ایسا شخص جس پر مجاری قاضی الحاجات نے تمام اپنی نقرئی قدرت کا اتمام کردیا ہو! اس کے تو اشارے پر قلزم حسن اس کی جانب بہ سکتا تھا۔ آہ نعمانی اُس کے ہاتھ سے گیا۔

چار سال میں نجمہ اَب بہت متغیر ہو چکی تھی، اس کی وہ حیاتِ معصوم جن کو پہلی بار نعمانی نے آکر چھیڑا تھا اَب ایک مستقل درد ——— دردِ محبت کی شکل اختیار کر چکی تھیں اس کے وہ جذبات سکون پرور جنہوں نے مرد کے اِقدامات محبت کی پہلی بار یورش دیکھی تھی۔ اِس قدر مشوش اس درجہ "طمانیت ربودہ" اور اتنے جراحت خوردہ ہو گئے تھے کہ کسی چھوڑ کر چلے جانیوالے کی یاد میں وہ اس کو ایک لمحہ چین نہیں لینے دیتے تھے۔ نجمہ نے اپنی نسوانی سادہ دلی سے نعمانی کو اوّلین محبت آزمائی کا موقع دیا تھا۔ آہ! وہ ابتدائی زمانہ ——— وہ محبت کا دورِ اوّلین کس درجہ خوشگوار اور اُمید افزا

نظر آرہا تھا اور اب ؟ اَب ؟؟

جان کیسی عشق میں وقفِ صعوبت ہوگئی!

نعمانی اَب ایک ایسا آدمی تھا وہ ایک دَولتمند کے سامنے ہرگز اپنے "سبدِ تمنا" کو لے کر نہیں جائے گی۔ وہ اس کو طامع اور حریصِ زر خیال کریگا نہیں اَب نعمانی سے اس کا اِتصال تاقیامت ممکن نہیں لیکن وہ اپنی غائبانہ یاد، اپنی مستتر پرستش سے اسے باز رکھ سکتا تھا؟ نہیں۔

نعمانی چار سال بعد جو احسان صاحب کے پاس آیا تو وہ (احسان صاحب) بھی اس کی پوزیشن اور ثروت سے کچھ ایسے مرعوب ہوئے کہ ان کا مخلصانہ طرزِ عمل تکلف سے بدل گیا۔ نعمانی کو فوراً اس کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے بہت ہی جلد اپنے سعادتمندانہ اطوار اور تکلف شکن طریقوں سے پھر وہی درجہ ان کی نگاہوں میں حاصل کر لیا جو چار سال قبل تھا۔ یہ تو ایک بزرگ سے خورد کا مقابلہ تھا، جس کو ایک طرف سعادتمندی دوسری طرف پدرانہ بزرگی علائق خوشگوار میں بدل دیا کرتی ہے لیکن اس علاقہ کے علاوہ دُنیا میں ایک ایسا "واسطہ" بھی ہے جو علائق صلبی وغیرہ سے بالکل ہی مختلف ہے اور جس میں تکدر رونما ہو جانے کے بعد پھر اتحاد کی لہریں دوڑنا بہت بڑی حد تک ممکن ہو جاتا ہے، ایسا علاقہ نجمہ اور نعمانی کے درمیان تھا۔ اگرچہ اُس پر خارجی موثرات کی دراندازی سے کوئی ثقل پیدا نہ ہوا تھا لیکن خالق محبت کی عادت میں داخل ہے کہ وہ اپنی عطا کردہ (یا تقسیم کردہ) محبت میں بھی بات بات پر بدگمان ہو جاتا ہے، غیور نجمہ اَب نعمانی کی پوزیشن اپنے سے بہت بلند دیکھ

آر رفع سمجھنے لگی تھی۔ چنانچہ اس نے علانیہ "مجرم ثمردت" نعمانی کی مواجہہ سے مقاطعہ کر دیا پہلے تو نعمانی اس کے طرزِ عمل کو سمجھ نہ سکا۔ لیکن بدستور اپنے تغیر ولغوذ والے اثرات کو مجتمع کر کے نجمہ کی نفسیات سے مقابلہ کیا تو تمام باتیں اُس کی سمجھ میں آگئیں "دیوانی لڑکی" وہ ہونٹوں میں بڑبڑاتا ہوا اُسکی تلاش میں زنانخانہ میں آگیا لیکن اس کو محوِ خواب ناز پاکر واپس چلا گیا۔

ایک دن احسان صاحب نے کسی مسرت انگیز فیصلہ سے نعمانی کو آگاہ کیا تو فرطِ انبساط سے اس کا چہرہ روشن ہوگیا اور یہ زبردست منطقی اس قدر گنگ ہوگیا کہ گویا بولنا جانتا ہی نہ تھا۔ آہ نجمہ اس کی ہونیوالی تھی۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے'

لیکن اس کے لئے ایک اندوہ، مہلک غم مقدر ہو چکا تھا۔ وہ یہ کہ نجمہ اس رشتہ کے لئے تیار نہ تھی"!

"تو پھر اپنے مفلوک الحال نعمانی کو یاد کرنیوالا وہ کون تھا؟" نعمانی نے اس خبرِ بد کو سن کر سر پیٹتے ہوئے اپنے سے کہا۔

میاں نعمانی کیفیت نیم شعوری کے ماتحت پڑے ہوئے نہ معلوم کیا کیا بڑبڑا رہے تھے۔

احسان صاحب بھی نجمہ کے اِس فیصلہ سے بے حد متحیر تھے، اُنھوں چند بار پیار سے اس کو سمجھانا چاہا لیکن اس غزالِ رعنا نے ہمیشہ اُن کے مشاغلہ سے رم اختیار کیا۔ نعمانی نے بھی بارہا کوشش کی کہ کہیں نہ کہیں نجمہ کو

جائے اور اس کی ستم شعاری کی داستان سنا کر اس سے طالب رحم و تلطف ہو لیکن اس نے اس کی ہر اس قسم کی کوشش کو مسترد کر دیا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی اندر یہ جناب فلسفی یہ قابل مفکر ایک عام انسان سے بھی پست تر نظر آنے لگے تمام بلند خیالات ہوا ہو گئے اور ان کی جگہ حواس پر مجنونیت مسلط ہو گئی۔

ایک روز نعمانی کے کمرے میں نجمہ کی مرغی کا خوبصورت چھوٹا سا بچہ کہیں دروازہ کی درازیں سے آ گھسا اور ماں سے جدا ہو کر لگا چاؤں چاؤں کا شور مچانے۔ ادھر غریب ماں باہر سے کٹ کٹ کر رہی تھی اور یہ اپنی مہین آواز سے کان پوٹے کئے ڈال رہا تھا، جب بے رحم نعمانی اس کو اس کی مہجور ماں کے پاس پہنچانے کے لئے ٹس سے مس نہ ہوا تو عورت کا دل جو بہت دیر سے ماں کی بیتابی پر بے قرار ہو رہا تھا اس کی زیادہ تاب نہ لا سکا آہستہ سے زنانخانہ کا دروازہ کھلا اور کسی نے آہستہ سے داخل ہو کر مرغی کے بچے کو پکڑنے کی کوشش کی، ناسپاس جانور اس عنایت کو نہ سمجھا، پھر سے اُڑ کر نعمانی کی کرسی کے نیچے آ کر شور مچانے لگا۔ آپنوالے نے خشمگیں تیور سے بچے کی اس حرکت کو دیکھا۔ اس کے بعد چتون بدل کر کرسی پر دراز ہونیوالے بیحس انسان کی طرف نظر ڈالی۔ وہ بیجان ساڈھانچہ جو کئی منٹ سے کرسی پر دہرا ہوا تھا متحرک ہوا اور کمرے میں سے بھاگ جانے کی کوشش کرنیوالی کی کمر میں تیزی سے ہاتھ حائل کر کے گھٹنوں کے بل اسکے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بچے صاحب دروازہ کھلا دیکھ کر اپنی مادرِ مہربان کے آغوش

میں جا پہنچے تھے۔ چنانچہ اب اس کمرے کی خاموش فضا میں بجز زور زور سے ڈھڑکنے والے دو دلوں کی ڈھڑکن کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"نجمہ! یہ تمہاری کیا حرکت تھی؟" کپکپاتی ہوئی مردانہ آواز نکلی۔

"مجھے جانے دیجئے۔ چھوڑ دیجئے ——— میں جاؤں گی" دوسری شیریں آواز آئی۔

"اچھا جاؤ" مردانہ لہجہ میں اب زور پیدا ہو گیا اور مخاطب اپنے قد کی پوری لمبائی تک تن کر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے کبھی کسی بے قصور انسان کو بلا وجہ ڈانٹا ہے؟ اور پھر اس کی بیگناہی کا دفعتہً خیال آتے ہی ایک ہلکی سی ندامت اپنی روح پر مسلط محسوس کی ہے؟ بس وہی کیفیت اس وقت نجمہ کی تھی۔ اس کی ناراضگی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ نعمانی ہر طرح بیقصور تھا اس نے تو اب تک لفظ محبت بھی اپنی زبان سے نہیں نکالا تھا" پھر اس سے خواہ مخواہ کشیدگی کی وجہ نجمہ کو اپنے غیر مہذبانہ طرز عمل پر افسوس ہوا اور چند سیکنڈ کے لئے عالم تذبذب میں کرسی کا بازو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ نعمانی نے اس "پشیمانِ جفا" کے جذبات کو ایک منٹ میں پڑھ لیا، صاف لہجہ میں بولا "نجمہ! تم کو مجھ پر میری روح پر ہر طرح کے اختیارات حاصل ہیں۔ لیکن میں تمہاری اس بالمعمہ سرد مہری کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں جس طرح تم نے میرے لبوں تک پہنچے ہوئے پیمانۂ مسرت کو پاش پاش

کیا ہے۔ اس کی تو میں شکایت نہیں کرتا کیونکہ تم کو اپنی آیندہ زندگی کا اختیار ہے۔ اگر تم کسی اور خوش نصیب سے اپنی حیات کی مسرتیں وابستہ کرچکی ہو تو اللہ تمہیں کامیاب کرے۔ لیکن مجھ سے کیوں روٹھی ہوئی ہو؟ بلا وجہ بغیر سبب، میں نے کونسی خطا کی ہے آخر؟" نعمانی کی اندوہگیں آواز باوجود انتہائی ضبط کے بھرّا گئی، کوئی سبب ہوتا تو نجمہ بتاتی، اسی طرح مذبذب کھڑی رہی۔ آخر جی کڑا کر کے بولی۔

"صاحب اب آپ بفضلہ امیر کبیر ہیں۔ اور ہم معمولی حیثیت کے انسان۔ میں نے سمجھا ———— مجھے خیال ہوا ————

وہ کوئی معقول بات نہ کہہ سکی۔

"بولو۔ بولو تمہیں کیا خیال ہوا؟ نعمانی نے اصرار سے دریافت کیا

"میں سمجھی کہ اب آپ ———— ہم کو بھول جائیں گے۔" نجمہ نے دبی زبان سے کہا۔

"لیکن یہاں بالکل الٹا معاملہ ہے۔ دولتمند ہو کر میں تو تم کو نہیں بھولا تم ہاں اپنے مفلوک الحال" نعمانی کو بھول گئیں" نعمانی نے اپنی کتاب کے حاشیہ پر لکھی ہوئی سطر یاد دلاتے ہوئے کہا۔ نجمہ کے حسین چہرہ پر عرقِ انفعال آگیا۔ اس کی محجوب نظریں بالکل زمین پر جھک گئیں، لیجئے اب تو آپ کو یقین آگیا کہ وہ سطر اسی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی؟"

"اچھی نجمہ! تو پھر تم مفلوک الحال نعمانی کو پسند کرتی ہو۔ مرفہ حال نعمانی کو پسند نہیں کرتیں؟" نعمانی نے اُن شرگیں آنکھوں کو کسی قدر اپنی جانب

متوجہ کر کے دریافت کیا۔

"جی ہاں" ایک پست لہجہ میں جواب دیا گیا۔

"لیکن تم کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں نادار انسان ہوں؟" نعمانی نے پوچھا۔

"میں نے آپ کی اور لوسیا کی گفتگو سن لی تھی" اعتراف جرم کے طور پر کہا گیا۔

"خوب! اچھا سنو۔ تمہارا نعمانی اس قدر دولت مند نہیں ہے جس قدر تم اس کو سمجھتی ہو۔ تیس لاکھ روپیہ میں سے انتیس لاکھ روپیہ تو خدمات عامہ کے لئے وقف ہے۔ ایک لاکھ کی آمدنی سے میرا گذارہ ہوتا ہے، کیا تم دو تین سو روپیہ ماہوار کی آمدنی والے انسان کو امیر کبیر کہہ سکتی ہو؟" نعمانی نے فرشتوں کے سے معصوم لہجہ میں پوچھا۔ یہ نجمہ کے لئے بالکل جدید انکشاف تھا، اس کی نظر سے "خادم" کا دوسرا پرچہ نہیں گزرا تھا چنانچہ وہ نفس کش و مجسمہ ایثار نعمانی کو پھر اسی قدر بلند سمجھنے لگی جس قدر اس کو پہلے سمجھتی تھی، مسرت کی لہریں اس کے نازک لبوں پر تبسم کی شکل میں رقص کر رہی تھیں، وہ صرف اس قدر کہہ سکی "مجھے معاف کر دیجئے ——— دنیا میں آپ جیسے اچھے (کس قدر سادہ لفظ ہے) بہت کم انسان ہوں گے مجھے آپ کے زرّین کارناموں سے بے انتہا ......" زبان نے دل کی ترجمانی میں زیادہ معاونت نہیں کی۔

"تو پھر چچا میاں کے فیصلہ کا کیا جواب ہے؟" اُس نے اشتیاق سے نجمہ کے مُلائم و نازک ہاتھ کو تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے پُوچھا۔ اسی اثناء میں مرغی اپنی مالکہ کو اِس کمرے میں دیکھ کر کٹ کٹ کرتی ہوئی مع اپنی ننھی سی فوج کے آگئی "نکل کمبخت یہاں سے" کہتی ہوئی نجمہ اُس کے پیچھے دَوڑی اور کمرے میں سے بھاگ گئی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔

میری بہنو اور بھائیو :- میں آپ سے درخواست کرتی ہوں
کہ جو آپ اپنا قیمتی وقت زندگی کے دو قیمتی [illegible] پڑھنے سے فائدہ
کریں - اگر آپ میری تحریر دل لگا کر عمل کریں تو آپ انسانیت کے ہونے
آپ یہ میرا مضمون آخر تک پڑھ لیں - مجھے یقین ہے کہ آپ کو کچھ فائدہ
ہو - تو لیجئے سنیئے :- جو اچھے ناول ہیں [illegible] وہ ناول
[illegible] ہیں [illegible] اور [illegible]
[illegible] زیادہ [illegible] عادل [illegible]
کی ناولیں پڑھنا [illegible] ممکن ہو آپ کو خدا کی عبادت کرنے پر
مجبور ہو جائیں گے - وہ [illegible] ہے کہ آج کل کے نوجوان لڑکے
اور لڑکیاں عاشق اور معشوق کی محبت کی کہانیاں ہوتی ہیں لڑکی
ہوتی ناولیں پڑھنا پسند کرتی ہیں - آپ ایسا نہ کیجئے - [illegible] ناولیں
پڑھنے سے آپ کے دل محبت کی بیماری لگ جائیں - آپ نے سنا
[illegible] ہوگا کہ محبت اندھی ہوتی ہے [illegible] اس بیماری سے
بچنے کی کوشش کیجئے - [illegible] ہے کہ آپ محبت بھری
ناولیں مت پڑھا کیجئے - [illegible] - [illegible]
[illegible] اور [illegible] کی [illegible]
[illegible] کہ اس بیماری لگ گئی ہے تو وہ اب [illegible] اس [illegible]
[illegible] یا مرتے - وہ جو ناولیں پڑھنے بیٹھی تو پڑھنے
ہوتی دل میں ہوتے گا کہ [illegible] معاملے میں دخل نہیں - یہ
بات [illegible] یہ میرا فرض ہے کہ سب [illegible] اس سے باخبر کروں -
[illegible] سو [illegible] یہ میں کرا
[illegible] نام [illegible] ہوتا کہ [illegible]

زندگی کے دو قہقہے

is a very interesting book.

This story is not as good as title according to its name.

Zindagee kay thow Kahkahams
wrote by.
[redacted]
E. R. Majid.

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زدند

"میں یہ سوچتا ہوں کہ یورپ کی لڑائی میں آج کل یہ جو توپیں چل رہی ہیں اُن سے بدک کر اس گائے یا بیل نے جس کے سینگوں پر ہماری زمین قائم ہے اگر اس کرۂ ارض کو پانی میں پھینک دیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟"

"تمہاری فکر ہے تو معقول۔ مجھے اس سے ایک اور خطرہ لاحق ہوگیا ہے وہ یہ کہ ہماری زمین پانی پر تیر سکی تو کونسا حصہ سطح آب کے اوپر ہوگا اور کونسا پانی میں!"

E. R. P.M

"پاگل ہے" حامد نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"لیجئے۔ یہاں آج دنیا کے اہم ترین مسئلہ پر رائے زنی ہو رہی ہے اور اس شخص کو کوئی فکر ہی نہیں ہے۔"

"مجھے یہ فکر ہے کہ اگر آج چندرا حسب وعدہ سینما میں نہیں ملی تو کیا ہوگا۔"

"زیادہ سے زیادہ یہ کہ تم مایوسی میں خودکشی کرلو گے یعنی ایک ہی جان ضائع ہوگی اور اگر زمین پانی میں پھینک دی گئی تو"

"تو میری چندرا بھی ضائع ہو جائے گی اور میرے لئے تمام کائنات تباہ ہو جائے گی۔"

"پاگل ہے۔" اس بار میری باری تھی۔

"لیکن یہ چندرا ہے کس چمن کی طوطی؟" مجید نے دریافت کیا۔

"اچھا آپ یہ بھی نہیں جانتے؟"

"خوب تو گویا آپ کی چندرا کوئی معروف ہستی ہے۔"

"اِتنی غیر معروف بھی نہیں کہ کوئی اُس کو نہ جانتا ہو۔ اَرے بھئی ٹھاکر حکم سنگھ کی لڑکی ہے۔"

"یہ دوسری حماقت ہے۔ گویا ٹھاکر حکم سنگھ بھی ہٹلر ہیں یا شیطان۔"

"تم دونوں یقیناً پاگل ہو۔ میاں وہی ٹھاکر صاحب ہیں جو بار بار ریڈیو پر عجیب وغریب تقریریں کر چکے ہیں اور اَب پندرہ تاریخ کو "میری پراسرار زندگی کے چند سیاہ اوراق" کے عنوان سے بولنے والے ہیں۔"

"ہونگے کوئی ہم نے اَب تک اُن کی کوئی تقریر نہیں سُنی۔ اَب تم نے اِشتیاق دلا دیا ہے تو پندرہ تاریخ کو ہم بھی اپنے چند منٹ ضائع کریں گے تم کو معلوم ہے اٹھارہ تاریخ۔"

"ہاں ہاں میں نے پروگرام میں دیکھا تھا اُٹھارہ تاریخ کو مجید بھی "اپنی عمر کے بدترین دو سال" کے عنوان سے بولنے والے ہیں۔ کیسا بولو گے مجید؟"

"خوب پہلے آپ کو سنا دوں اپنی تقریر۔"

" نہیں یہ مقصد نہیں۔ محض افسانہ ہوگا یا واقعہ ؟"

" خالص واقعہ۔ اُس کے طفیل میں تو اِتفاقاً قدرت نے اُن کو انجینئر کی جگہ عنایت کی ہے "

" اوہ یس۔ تم تو باہر کی ڈگری کے مالک ہو۔ لیکن سُنا تھا کہ پانچ سال سے پریشان حال اور بیکار ہو "

" اَب نہ پریشان ہیں نہ بیکار۔ حامد کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اپنی معروف چندرا کو پرسوں یعنی پندرہ اگست کو اپنے ہمراہ لاکر یہیں اُس کے مشہور باپ کی تقریر سُنو "

" میں وعدہ نہیں کر سکتا۔ معلوم یہ ہوا کہ چندرا اپنے باپ کی اس تقریر سے خوش نہیں ہے۔ بلکہ جب سے اس کو یہ معلوم ہوا ہے کہ ٹھاکر صاحب کوئی اس قسم کی تقریر کرنے والے ہیں، باپ بیٹی کے تعلقات کافی کشیدہ ہو گئے ہیں "

" معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر کا کوئی باب چندرا کی روشنی سے منور ہے، جس کو وہ تاریک ہی رہنے دینا چاہتی ہے "

پندرہ تاریخ کو حامد تنہا آیا۔ چندرا اُس کے ساتھ نہیں تھی " یہ ہم دلی سے بول رہے ہیں، اب آپ ٹھاکر حکم سنگھ صاحب کی تقریر " میری پُر اسرار زندگی کے چند سیاہ اَوراق " کے نام سے (عنوان کے بجائے۔ بیچارے ریڈیو والوں کو عنوان کی اُردو بگاڑنے کی قدرت نہیں تھی ورنہ وہ اس پر طبع آزمائی کی کوشش کرتے) سُنیئے " ریڈیو پر آواز آئی۔ ہم تیار ہو کر بیٹھ گئے۔

"مذہب نے ہم کو کیا دیا اور اخلاق نے ہم کو کیا سکھایا۔ اس چیز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ میری زندگی کے حالات سنیئے۔"

ٹھاکر صاحب کی صاف آواز آئی "بیشک مذہب نے ہم کو چند رنجشیں، بیشمار خونیں لڑائیاں، اور لاتعداد انسانی تفرقے عنایت کئے ہیں۔ اس طرح اخلاق نے بھی ہماری فطری آزادی کے سامنے پابندیوں کی دیوار چن رکھی ہے۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم کو مردِ بیمار کی طرح ایک دن تھرتھرا کر دونوں موتیوں کے سامنے گرنا پڑتا ہے۔

میں شاید چند سال پہلے اِس عنوان پر تقریر کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اَب جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اَب اپنی بُری سے بُری بات زبان پر لانے میں شرم نہیں محسوس کرتا۔

میری عمر پچیس (۲۵) سال کے قریب ہو گی کہ والد صاحب کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ رسماً میں بھی چند روز تک مغموم رہا۔ دل میں اگر ذرا بھی خوشی کی گدگدی ہو تو رنج سہنے کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی دِل بھر کر غم کا لُطف نہ اُٹھا سکا۔ غم سے لُطف اندوزی پر آپ چونکیں گے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے پچیس (۲۵) سال کی عمر تک رنج اٹھایا ہی نہ تھا۔ ممکن ہے حیات کے سانحات کا اِس دَوران میں کبھی تاریک سایہ میرے اُوپر بھی پڑا ہو۔ مگر میری خوش باش اور لا اُبالی طبیعت کبھی اس سے متاثر نہیں ہوئی یہی وجہ تھی کہ میں آرزوئے غم اپنے سینے میں پنہاں رکھتا تھا، اَب باپ کے مرنے سے پہلی بار ایک دھچکا سا لگا مگر یہ دھچکا بھی ایک خوشگوار ہچکولے میں تبدیل ہو گیا وجہ یہ تھی کہ والد نے

ایک خطیر رقم ترکہ میں چھوڑی تھی جس کا میں بلا شرکت غیرے مالک تھا۔

ہمارے بہت سے مکانات تھے۔ جس مکان میں میں رہتا تھا اُس کے نیچے کے حصے میں ایک بابوجی کرایہ سے رہتے تھے۔ بے نفس اور بے حد ہمدرد۔ انسان فطرتاً نہایت وسیع ضروریات لے کر پیدا ہوا ہے (کم از کم اس زمانہ میں یہ میرا عقیدہ تھا) مثلاً سب سے پہلے تو پرورشِ نفس اور اس کے متعلق دیگر بیشمار ترغیبات و تحریکات۔ کھانا پینا۔ جانوروں کی طرح۔ تفریح عیش اور عیش کے سامان کی فراہمی۔ خواہشات نفسانی اور اس کو رفع کرنے کے حسین مواقع وغیرہ وغیرہ اَب دنیا میں آکر بھی انسان دھکے کھاتا پھرے اور اپنے دیگر ہمجنس کی ضروریات کو ذبح کر کے خود کو فتحمند نہ بنائے تو اس سے زیادہ اس کی تخلیق کی توہین نہیں ہوسکتی۔

شباب کا زمانہ تھا۔ میرے اسفل اعضا سے لے کر افضل اعضا تک جوانی کا رَس چوسنے کے لئے بیقرار تھے۔ دوکانداری کی قسم کی عیاشی کا میں قائل نہیں، شباب کی سرگرمیاں خارج کرنے کے لئے میں نے ہمیشہ ایسی ہستی کا انتخاب کرنا پسند کیا جو آسانی سے گرفت میں آجانے کی عادی ہو بلکہ پھڑپھڑاتی ہوئی آغوشِ تنگ میں گھسیٹی جاسکے۔ بابوجی کی جوان لڑکی اس قسم کی مرد بیزار ہستی تھی، پیاری پیاری صورت جوان لیکن ننگ جوانی۔ جو انسان جوانی کے استعمال میں بخل کرے وہ ننگ جوانی نہیں ہے تو کیا ہے۔

میں نے دو دفعہ اس کو پھانسنے کی کوشش کی لیکن دونوں بار وہ میرے چنگل سے نکل بھاگی۔ میں نے محبت و درد محبت کو ہمیشہ مرد کی جانب سے

"مردانہ بزدلی" سمجھا۔ پھر پیسوں کی فراوانی اور اپنی توانائی کے باعث مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ میں کسی سے لگ کر محبت کرتا۔ اور اپنی تسکین شباب کے لئے اس وقت تک انتظار کرتا۔ جب تک سماجی قانون کے مطابق وہ صرف میری بنجانے کا وعدہ نہ کرلیتی۔ یہ دردسری وتضیع اوقات تھی۔ والد باوجی کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اور باوجی بھی ہمارے اوپر اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی نوعی حماقت کا وہ پہلو جس کو آپ لوگ بڑے احترام سے احسان احسان پکارتے ہیں باوجی کی بدقسمتی سے اس قدر روشن تھا کہ اس کے ذریعہ سے وہ ہمارے گھرانے پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن اس بیوقوف انسان نے اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریات سے قطع نظر کرکے ہمیشہ ہم کو آسائش پہونچانے کی کوشش کی۔ اس کو اہل دنیا احسان کہتے ہیں اور میں انسانی کیرکٹر کا کمزور ترین جزو۔

"اچھا آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" شانتا نے کپکپاتے ہوئے پوچھا۔ میں زینے میں اس کا ہاتھ تھامے کھڑا ہوا تھا۔

"کیا چاہتا ہوں۔ تم نہیں سمجھتیں؟ شانتا تم کو معلوم ہے میرے اوپر کتنی لڑکیاں مرتی ہیں۔ کیونکہ میں دولتمند ہوں۔ جوان ہوں حسین ہوں"

"تو میں کیا کروں"

"تم یہ کرو کہ اپنے کو میرے سپرد کردو۔ اس قسم کے چند لذید منٹ انسان کی طویل بے کیف زندگی سے بدرجہا بہتر ہیں"

"اچھا چھوڑ دیجئے میرا ہاتھ۔ بابوجی دیکھ لیں گے۔" خوب تو گویا وہ میرے مطالبہ کو سمجھتی تھی، اس کو معلوم تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں کسی اور وقت اس کو تفصیل سے سمجھاؤں گا، چنانچہ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی میں نے اس کو مفصل طریقے سے سمجھا دیا۔

چند ماہ بعد قدرت کی بدذوقی کے آثار شانتا میں نمودار ہونے شروع ہوئے تو بابوجی نے سر پیٹ لیا، انھوں نے گن گن کر اپنے احسانات جتانے شروع کئے۔ اور میں نے ہنس ہنس کر ان کا مذاق اڑایا۔ ان کی بیوی نے مجھے پیٹ پکڑ پکڑ کر کوسا۔ محلہ والوں نے میرے اوپر انگلیاں اٹھانی شروع کیں سب بیوقوف تھے۔ مجھے ایک مقصد حاصل کرنا تھا۔ میں کیوں نہ اسے حاصل کرتا۔ آخر میں اپنی ایک شدید ضرورت کو شانتا کی مرضی، اس کے والد کے خوف اور محلہ والوں کے طعن کے ڈر سے کیوں روکتا۔ "لڑکی کی زندگی تباہ ہوگئی" لوگوں نے کہنا شروع کیا۔ اس میں تباہی کی کونسی بات تھی۔ احمق کہیں کے۔

اس قسم کے میری زندگی میں صدہا واقع پیش آئے۔ میں نے جی بھر کے داد شباب دی۔ عصمت میرے سامنے لرزتی ہوئی آئی اور خون میں نہائی ہوئی واپس جاتی۔ دوشیزگی میرے پہلو میں کپکپاتی رہ جاتی۔ خواہش میرے ہاں سے سربلند نکلتی اور معصومیت کچلی ہوئی۔ روندی ہوئی میرے ہاں سے بھاگتی۔ اس کھیل میں روپیہ میرا بڑا معاون رہا۔ لیکن وہ تھک چکا تھا۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور کچھ عرصہ بعد تو مجھے اس کا جنازہ اٹھانا پڑا۔ دولت

ختم ہوگئی اور اُس کے ساتھ ہی میری مزیدار زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

ایک ایک کر کے تمام مکانات بک گئے صرف ایک باقی رہ گیا، وہ بھی اِس وجہ سے کہ اِس پر چچازاد بھائی قابض تھا۔ اب میرے لئے کہیں ٹھکانا نہ تھا آخر آلہ آباد میں والد کے ایک پرانے دوست کے ہاں جا دھرنا دیا۔

مجھے یہ دیکھ کر کتنا تعجب ہوتا تھا کہ لوگ وہی مذہب و اخلاق کے قائم کردہ اصولوں پر چل کر اپنی زندگیاں بے کیف بنائے ہوئے تھے۔ اگر کسی شخص کو کہیں سے روپیہ مار لینے کی قدرت تھی تو وہ اس سے فائدہ اُٹھانے میں ہچکچاتا تھا۔ اگر کسی مرد کو کسی لڑکی سے لگاؤ تھا تو وہ اس کو اپنے تصرف میں لانے سے ڈرتا تھا۔ اگر کوئی آزادی سے کسی کو قتل کر کے یا زہر دے کر جائداد پر قابض ہو سکتا تھا۔ تو وہ خوف خدا اور ضمیر کی مہمل آواز سے بدک رہا تھا۔ ارے بھائی یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ تم ان تمام باتوں پر قادر ہوتے ہوئے بھی اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ رہے ہو۔ عجیب لوگ تھے۔

یہ والد کے دوست وکیل تھے۔ اچھی خاصی آمدنی تھی، خاصا گھر تھا، میں اُن کے ہاں تقریباً چھ ماہ رہا۔ اس دوران ۲، ۳ دفعہ اُن کی بھتیجی پر ہاتھ صاف کیا۔ پیسوں کی ضرورت تھی اِس لئے تین بار تھوڑی تھوڑی رقم چرائی۔ لیکن اِس سے بھلا نہیں ہوا۔ مجھے معقول رقم کی ضرورت تھی۔ آخر ایک دن داؤں لگ گیا۔ کوئی دو ہزار کی رقم ماری، وکیل صاحب کو معلوم ہوا والد کے دوست تھے اور وہی مروت و احسان، پاس دوستی وغیرہ کا قانون اُن کے ہاں بھی چل رہا تھا۔ چنانچہ صاف بچ گیا۔ انھوں نے یہ کیا کہ دوسرے دن مجھے گھر سے نکالدیا اور

میں خوش خوش دُنیا کا لُطف لینے اور اہلِ دُنیا سے مقابلہ کرنے نکل گیا۔

دو ہزار روپئے کی کیا حقیقت تھی ایک مہینے کے اندر صاف ہوگئے۔ اب میری دست درازیاں گھروں سے نکل کر میدان میں آگئی تھیں۔ مجھے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لوگوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ وہ لوگ جن کا مجھ سے کچھ واسطہ تک نہ تھا جن کو قانون اور قانون کا ہر غلام معصوم و بیگناہ خیال کرتا تھا، میرے ہاتھ سے لُوٹے گئے۔ صاحبِ اسباب اِنسانوں کے اَسباب کو میں نے زبردستی زیر کیا۔ اُن سے اَسباب چھینے اور اگر خود اُن کو کام میں نہ لا سکا تو اُن کو بھی نہیں لانے دیا، متعدد بار جیل کی ہوا کھائی۔ قسمت لیکن اچھی پائی تھی۔ تختۂ دار پر پیر رکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہر بار بری ہوا۔ ہاں جیل میں عمر کا کچھ حصہ صرف کرنا پڑا۔ اس طرح چالیس سال سے تجاوز کرکے میں پچاس سال کو بھی عبور کر گیا۔ زندگی کے میدان میں کافی دوڑ لگا چکا تھا، تھک گیا۔ اِس تھکاوٹ کے ساتھ ہی میں نے اپنی جانب اخلاق کے سپاہی اور مذہب کے پاسبانوں کو مضبوط مضبوط بیڑیاں لئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ جسم میں سکت نہیں رہی تھی کہ ہاتھ پیر مارتا، بیدم ہو کر اُن کے سامنے گر پڑا۔ ان لوگوں نے میری اَب تک کی بغاوت پر زیادہ سختی نہیں کی بلکہ محبت سے مجھے پھُسلا پھُسلا کر ایک ایک کرکے تمام بیڑیاں میرے پیروں میں ڈالدیں۔

اَب میں ایک اَمن پسند شہری تھا۔ میں نے مختلف کام کرکے کچھ پیسے کمائے اور پچپن سال کی عمر میں ایک مختصر سی دوکان لگائی جس نے دس سال کے عرصہ میں مجھے بہت بڑی حد تک فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا۔

دولت جب پھر میرے قبضہ میں آئی تو اُس نے اب مجھے طعنے دینے شروع کئے۔ کہ اب کہاں گئی تیری وہ اچھل کود۔ چل پھر جا دبوچ اَچھوتی لڑکیوں کو میں تیرے ساتھ ہوں۔ میں نے اپنے مرتعش ہاتھوں سے مشورہ لیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہ اب وہ کسی کو دبوچنے کی سکت اپنے میں نہیں پاتے ہیں۔ درندگی و بہیمیت کو جھنجھوڑ کر اُن سے استصواب کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ تو عرصہ سے دل کے مکان کو خالی کر چکی ہیں، عضلات کو چھیڑا تو بیشمار جھریاں اور ہوا نکلے ہوئے ٹائیر کی طرح ہر جگہ کا گوشت ہاتھ میں آگیا۔ اوہو تو اخلاق و مذہب انسان کی شباب باختہ عمر کی اِس حالت کا نام ہے! میں نے دل میں سوچا۔ خیر یونہی سہی۔ اپنی پچھلی ہماہمی کو کسی تو ذریعہ سے تسکین تو دیتا ——
معاف کیجئے میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ اچھا رخصت ہاں اِس بوڑھے کے تجربات زندگی کی قدر کیجئے۔ عمر کے ساتھ ہر شئے مجھسے بغاوت کر چکی ہے۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر عمر رفتہ کا ایک لمحہ بھی پھر ہاتھ آجائے تو میں سو جان سے پھر اس کو وہی دبوچ اور کھسوٹ میں صرف کر نیکی اب بھی آرزو رکھتا ہوں۔

دَرسرِ بازار می باید زعصیاں باختن

اچھا خدا حافظ"

"شیطان شیطان!" مجید نے چیخ کر کہا۔

"بہت خوب۔ یہ ہیں آپ کے خسر صاحب کے کارنامے؟" میں نے حامد سے کہا۔

"خسر صاحب؟ خسر کی ایک ہی رہی۔" اُس نے کھسیانے پن سے کہا۔

"اور یہ آپ کی چندرا خدا جانے کونسی خون میں ڈوبی ہوئی دوشیزگی کی یادگار ہوں گی۔ مجید نے کہا۔

حامد نے اِستکراہ سے مُنہ بناکر کہا "اَب مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"احمق ہیں آپ۔ چندرا کا اِس میں کیا قصور ہے وہ تو بیچاری بالجبر دنیا میں آنے پر مجبور کی گئی تھی۔

"اُف اُف۔ ٹھاکر حکم سنگھ شیطان ہے۔ یہ اسی کی چھوکری ہے۔" حامد نے کہا۔

"اور تم شیطان کے مرید ہو کہ ایسی لڑکی کو دل دے بیٹھے۔" میں نے جواب دیا۔

اَب ہم کو اٹھارہ تاریخ کا اِنتظار تھا۔ دیکھیں میاں مجید کیا بکواس کرتے ہیں، اس مذہبی ماحول اور تادیب پسند والدین کے آغوش میں پلے ہوئے اِنسان کے متعلق یہ خیال تو نہیں گذرتا تھا کہ اس نے بھی ایسے ہی کھیل کھیلے ہوں گے۔

"ہم دِلّی سے بول رہے ہیں۔ اَب آپ مسٹر مجید کی ایک شہادتی تقریر سنیئے۔"

ریڈیو پر اٹھارہ تاریخ کو آواز آئی۔ چند سیکنڈ تک وقفہ رہا۔ کھنکھارنے کی آواز آئی اِس کے بعد مجید نے بولنا شروع کیا۔

"میں غریب والدین کا نہایت اِنکسار پسند بیٹا ہوں میں نے زندگی کی

چھیڑ خانیوں کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں کی۔ میرے ساکن دماغ کی طمانیت آشنا خیالات لے مذہب آئین اخلاق اور قانون کو ہمیشہ اسی نہج پہ سمجھنے کی کوشش کی جیسا میرے والدین نے اُن کو سمجھا دیا تھا یا جیسا دُنیا اُن کو سمجھتی ہے اس معروف عام سادہ لوحی سے میں نے اکثر نقصانات بھی اُٹھائے لیکن میں آپ سے پیشتر ہی عرض کر چکا ہوں کہ حیات کے ناگوار تھپیڑے مجھے شروع ہی سے انسانیت کے لوازم نظر آتے رہے ہیں؛ (وقفہ)

جن اچھے لوگوں نے دُنیا میں بُرائی کے تخیل کو مٹانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے میرا ایک دوست شنکر بھی تھا جو مجھے تفریحاً اپنے ساتھ ولایت لے گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ پانچ سال تک ولایت میں کیا کرتا رہا۔ لیکن یہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا کہ میری یہ انجینیری کی ڈگری اُسی کے احسانات کا نتیجہ ہے۔

شنکر کو شروع ہی سے سوہضمی کی شکایت تھی جو بحری سفر میں اور زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ جب ہم ہندوستان کو لوٹنے لگے تو اس کی یہ شکایت بدستور برقرار تھی۔ ابھی ہم نے اقصائے مغرب کو خیرباد ہی کہا تھا کہ راستے میں اُس کی طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ میں تین شبانہ روز اس کے کیبن میں بستر سے لگا بیٹھا رہا۔ لیکن اُس کی حالت بدتر ہی ہوتی گئی۔ چوتھے روز جب اس کو افاقہ ہوا تو میں چلا آیا لیکن اُس نے مجھے پھر اپنے کیبن میں بلوایا۔ جان کنی کے آثار اُس کے چہرے سے ہویدا تھے اور اُس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی مجھے دیکھ کر وہ کچھ مطمئن سا ہوا۔ اور بدقتِ تمام مخاطب ہوا۔ "مجید میں ایک نہایت

اہم خدمت تمہارے سپرد کرتا ہوں اگر تم نے اس میں کوتاہی کی تو میری روح تمام عمر تمہارا تعاقب کرتی رہے گی۔ یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹا سا چمڑے کا بٹوا نکالا اور لرزتے ہاتھوں سے میرے سامنے رکھ کر بولا:

"اس میں تو نہایت قیمتی ہیرے ہیں۔ جائز طور پر خریدے ہوئے۔ یہ رسید ہے۔ تم کو یہ بملا تک پہونچانے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی اور اپنی ناجائز اولاد کی جس کا باپ میں ہوں۔ پرورش کر سکے۔ بملا الہ آباد میں محلہ گوجران میں رہتی ہے۔" میں نے احساس فرض کے ساتھ بٹوا اٹھا لیا اب جو شنکر کی طرف دیکھتا ہوں تو اسکی روح پرواز کر چکی تھی گویا وہ اس ہلکے بٹوے کی وزنی دولت کے نیچے دبی ہوئی تھی۔

پاس فرض و مذہب نے آخر شنکر کو مرتے وقت آکر ایک نیک سبق دے ہی دیا، اسی طرح دنیا میں بہت سے منحرف لوگوں کو ایسے ہی نیک سبق ملے ہیں۔ وہ دنیا میں وقت رحلت اچھا کام کر کے خدا کی محبت کے مستحق بن گئے ہیں۔

میرے پاس ایک کارآمد ڈگری تھی اور مستقبل کا ایک شاندار تصور میری روح میں خوشگوار تموج پیدا کر رہا تھا لیکن شنکر نے یہ فرض میرے سپرد کر کے ایک الجھن پیدا کر دی تھی۔ خیر الہ آباد کون سا دور ہے۔ میں نے سوچا وطن کے کنارے آتے ہی میں سیدھا الہ آباد پہونچا۔ ذرا وقت سے محلہ گوجران بھی مل گیا۔ اب اس میں بملا کو تلاش کرنا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ تو چار سال سے کہیں چلی گئی ہے۔ غضب ہو گیا۔ اب کہاں ڈھونڈوں۔ خدا خدا کر کے اتنا معلوم ہوا کہ وہ اپنے ماموں کے ساتھ لکھنؤ گئی تھی اس کا ماموں وہاں ڈاکخانہ میں

نوکر ہے۔ اس کا نام معلوم نہیں، لکھنؤ میں ایک نامعلوم اسم شخص کو تلاش کرنا ایک انجینیر کے بس کی بات تو تھی نہیں۔ ہاں پولیس سے اِمداد مل سکتی تھی۔ مگر میرا مشن پولیس کی اِمداد کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اب ہم لکھنؤ پہونچے۔ یہ ڈاکخانہ والے بھی قیامت کے ہوتے ہیں ولایت کے ڈاکخانہ والے تو ہوتے ہی آفت کا پرکالا ہیں لیکن ہندوستان کے ڈاکخانے والے بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ تین ڈاکیوں نے مِل کر آخر بابوجی کا کھوج نکال لیا۔

"کیوں آپ کو اس سے کیا کام ہے؟" بملا کے ماموں نے مجھ سے پُوچھا۔

"میں آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ صرف بملا کو بتا سکتا ہوں"

"تو آپ کو مایوس ہو جانا چاہیئے۔ بملا یہاں نہیں ہے۔ میرے پاس وہ بمشکل چھ ماہ رہی ہوگی، اس کے بعد وہ اپنے بھائی کے پاس دہلی چلی گئی"

"کیا آپ اُس کے بھائی کا نام بتا سکتے ہیں"

"اونکار اور وہ ٹریم کے کسی کارخانہ میں نوکر ہے" میں نے پتلون کی جیب میں رکھے ہوئے قیمتی بٹوے پر ہاتھ پھیرا، اطمینان کا سانس لیا۔ اور دِلّی کی راہ لی۔ یہاں پہونچکر میں نے کچھ دن دَم لیا۔ اِدھر اُدھر ملازمت کے لئے درخواستیں دوڑائیں۔ پیسے ختم ہوتے جا رہے تھے اور مستقبل ابھی کوئی اُمید افزا وعدہ نہیں کر رہا تھا، ممکن ہے میری عرضیوں کے جواب آئے ہوں لیکن میری خانہ بدوش زندگی کی وجہ سے مجھے نہ مِل سکے ہوں۔

چند روز کی دوڑ دھوپ کے بعد بملا کے بھائی کو بھی ڈھونڈھ نکالا۔ جو اپنے

راہوں سے بھی زیادہ بددماغ واقع ہوا تھا۔

"تم آخر اس سے چاہتے کیا ہو؟" وہ بار بار یہی سوال دُہرا رہا تھا۔ میں نے اب تک اس سوال کا جواب سوچا ہی نہ تھا۔ حالانکہ یہ اہم سوال نہ تھا۔ جو مُنہ پر آتا کہدیتا۔

"میں سمجھ گیا جو تم ہو۔ لیکن میں تم کو اِس کا صحیح پتہ نہیں بتا سکتا۔"

"اچھا تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟" میں نے اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرنے کے لئے پُوچھا۔"

"تم سی۔آئی۔ڈی کے اِنسپکٹر معلوم ہوتے ہو۔ اس وقت کہاں مَر گئے تھے جب وہ مردار یہاں سے بھاگی ہے۔" یہ میرے لئے جدید اِنکشاف تھا۔ میں نے ذرا صبر سے کام لیا، وہ پھر بولا۔

"مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ راہو کے ساتھ رنگون بھاگ کر گئی ہے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

میرے پیروں تلے کی زمین نِکل گئی۔ رنگون! اَب کے قسمت نے بڑی دُور پھینکا۔ سنکر کی رُوح مجھے اکسا رہی تھی اور وہ جنونِ سفر بن کر میرے جسم میں حلول کر گئی تھی، میں نے بملا کے بھائی سے راہوں کا حلیہ دریافت کیا اور چلا آیا۔

ہوٹل میں آکر میں نے دروازہ بند کر کے بٹوا جیب سے نکالا اور میز پر خالی کیا۔ نَو دانے۔ کیسے حسین پتھر تھے۔ خدا جانے اُن کی کیا قیمت ہوگی جب میں واپس اُن کو بٹوے میں بھر رہا تھا تو ایسا معلوم ہوا گویا بٹوے سے بھی

زیادہ خشک ہاتھ ہیروں کو واپس بھرنے میں میری مدد کر رہا ہے!

اِس دوران میں مجھکو کانپور میں ایک شکر کے کارخانہ میں دوسو روپیہ کی جگہ مِل گئی۔ اپنی قابلیتوں کے مقابلہ میں میں نے اپنے کو بہت سستا بیچ دیا تھا۔ لیکن میں دوسری جگہ کوشش کر رہا تھا جہاں کامیابی کے مستقبل قریب میں آثار نظر آرہے تھے۔

میں نے کانپور پہونچکر رامو کے متعلق برما کے اخبارات میں اشتہار دیا اور چھ ماہ تک اِنتظار کرتا رہا لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ آخر ایک دن کسی پولیس آفیسر کا جواب آیا جو مجھے اُنھوں نے پرائیوٹ طور پر روانہ کیا تھا۔ لکھتے تھے کہ رامو یہاں موجود ہے فوراً آپ چلے آؤ۔ اُن کا پتہ درج تھا۔ چنانچہ میں دوسرے ہی دن رنگون کی طرف چلدیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ وہ رامو صاحب تھے تو ہندوستانی لیکن کوئی دوسرے رامو تھے، پولیس آفیسر صاحب نے تو اِنعام کے پچاس روپئے ہی لے کر میرا پیچھا چھوڑا، اُن کو اس سے کیا غرض تھی کہ اصلی رامو ہے یا نقلی لیکن میں نے اس نقلی رامو سے کام لیا اور اُس کے ذریعہ اصلی رامو کو تلاش کیا۔ پندرہ بیس روز بعد معلوم ہوا کہ اصلی رامو کارخانہ میں آگ لگ جانے کی وجہ سے مر گیا ہے۔

"بملا کا کیا حشر ہوا"؟ میں نے نقلی رامو سے معلوم کیا۔ تیسرے روز اس کا وہ یہ جواب لایا کہ بملا کو اس کا بھائی شامو جو راولپنڈی میں لاری ڈرائیور ہے۔ لے اڑا ہے۔

میں نے رامو کے سامنے دیوان گی میں ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔

دوسرے روز میں نے کانپور استعفیٰ لکھکر روانہ کر دیا اور ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کا رُخ کیا۔

اس دوڑ دھوپ، اور سفر میں میری کامیابی کے لئے منتظر سعی زندگی کا ڈیڑھ برس برباد ہوگیا۔ میری پتلون کی جیب میں بے قیاس دولت تھی۔ لیکن کوٹ کی جیب میں نپے تلے پیسے تھے۔ حالانکہ اِن دونوں جیبوں میں کوئی زیادہ فاصلہ نہ تھا اور ہاتھ کی رسائی دونوں تک آزادانہ تھی لیکن جب ہاتھ بڑھا کوٹ کی جیب کی طرف۔ خواہ گولڈ فلیک سگرٹ خریدنے کے لئے۔ خواہ راتوں کو ہوٹلوں کے وسیع اخراجات ادا کرنے کے لئے

لاری ڈرائیور کا راولپنڈی میں پتہ چلانا زیادہ دشوار نہیں۔ یہاں بھی میں نے سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر کا پارٹ ادا کیا۔ شامو کو جا کر ایک ڈانٹ بتائی تو اُس نے سب کچھ اُگل دیا:

"سرکار رملا میرے ہی پاس ہے۔ مگر میرا مکان راولپنڈی نہیں ہے بلکہ میں لاہور میں رہتا ہوں پندرہ بیس روز سے میں گھر نہیں گیا ہوں۔ اب آپ کے ساتھ چلتا ہوں مگر مجھے حضور بخش دیا جائے۔ میں اِس لئے لے آیا تھا کہ رنگون جیسی جگہ میں ایک عورت ذات کس کی حفاظت میں رہتی"

"میں نے اس کو یقین دلایا کہ اس کو میں گرفتار نہیں کروں گا"

غرض ہم لاہور پہونچے۔ شامو مکان میں گیا اور ایک منٹ کے بعد ہی حواس باختہ باہر آگیا۔ صاحب غضب ہوگیا۔ آپ مجھے جھوٹا سمجھیں گے مگر محلہ والوں سے قسم دلا کر پوچھ لیجئے"

"میں اس قسم کے مایوس کن جوابات کا عادی ہو چکا تھا۔ میں نے دریافت کیا" آخر کیا ہوا ؟"

"وہ کسی بنگالی بابو کی بیوی کیساتھ نوکر کی حیثیت سے کشمیر چلی گئی ہے"
اور جموں کے راستے سے گئی ہے"

میرے اوپر تو سفر کا بھوت سوار تھا کشمیر کی راہ لی۔ بنگالی بابو کو ہوٹلوں اور ہاؤس بوٹوں میں تلاش کیا۔ مگر لاپتہ، آخر کافی پریشان ہونے کے بعد جس ہاؤس بوٹ میں وہ ٹھہرے تھے اس کے مالک سے معلوم ہوا کہ وہ واپس کلکتہ چلے گئے ہیں۔ تار آیا تھا۔ ان کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کا پتہ رجسٹر میں درج تھا۔ میں نے شامو کو چھوڑا اور ایک دفعہ پھر شمال سے مشرق کی طرف بھاگا۔

اب یہ بٹوا میرے چبھنے لگا تھا۔ ریل کی گھڑگھڑاہٹ۔ شہروں کے غل غپاڑوں ہوٹلوں کے خاموش کمروں میں اکثر ان حسین ہیروں کی سرگوشیاں سنتا راتوں کو جب سوتا رہتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی میرے پاس بیٹھا ہوا دانت کٹکٹا رہا ہے۔ ہیرے اس قید و بند سے کچھ خوش نظر نہیں آتے تھے۔

کلکتہ بھی آ گیا اور بنگالی بابو کا مکان بھی مل گیا۔ میں اپنا اسباب اسٹیشن پر ہی رکھ آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پھر کسی اور طرف سفر کرنا ہو گا۔ ڈگری برونے کار آنے کے لئے بیچین رہیگی۔ مستقبل میرے انتظار میں چشم براہ رہے گا اور میں یوں سفر میں دنیا سے سفر کر جاؤں گا۔

"آپ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے" ؟ بنگالی بابو نے پوچھا۔

"میں انسان ہوں اور نا معلوم کہاں سے آیا ہوں۔ کیا براہ کرم آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کی نئی ملازمہ بملا کہاں ہے؟"

"اچھا ہم سمجھ گیا۔ تم اس کا کوئی پرانا آدمی ہے، وہ سامنے اصطبل کے ادھر احاطہ کے پاس ہے اس کی کوٹھری۔ رات کو ہم جوان عورت کو گھر میں نہیں رکھتا ہے، وہ وہاں ملیگی۔"

مجھے ایک قسم کا سناٹا سا آگیا۔ جس طرح منزل قریب آجانے کے بعد تھکے ہوئے مسافر کے پیر بہت وزنی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح میرا اس کوٹھری تک پہونچنا مشکل ہو گیا۔ آخر میں ڈگمگاتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا کوٹھری کی طرف چلدیا۔ "دو سال" اُفوہ! میری عمر کے قیمتی دو سال ایک بھوت نے غارت کر دیئے۔ میں نہ معلوم کیا ہو جاتا۔ نا معلوم کیا بن جاتا۔

میں غڑاپ سے کوٹھری میں گھس گیا۔ لیکن معلوم ہوا میں یہاں تنہا ہوں۔ کوٹھری میں صرف ایک لیمپ روشن تھا، ایک چار پائی پڑی ہوئی اور ایک رسی پر کچھ میلی ساڑیاں لٹک رہی تھیں۔

بملا کہاں گئی؟ میں نے حیران ہو کر دل میں کہا۔ آخر باہر آیا اور سائیس سے دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ ابھی تو یہیں تھی پیشاب کو گئی ہو گی۔

میں دروازہ پر چوکیدار کی طرح آ بیٹھا۔ سگرٹ پینے کا کوئی شمار نہ تھا جب نئی دیا سلائی خریدتا تو معلوم ہوتا کہ کافی پی چکا ہوں۔ اب بھی میں دھواں اُڑا رہا تھا کہ پاس آہٹ ہوئی۔ اندھیرے میں کوئی ملگجی سی شئے نمودار ہوئی اور روشنی کی زد تک پہنچتے پہنچتے عورت بن گئی۔

میں نے بملا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانچ سال شنکر نے ولایت میں صرف کئے۔ اس کے کم از کم ایک سال پہلے اس نے وہ گناہ کیا ہوگا۔ جس کا خمیازہ چھ سال کے دو سال بعد تک میں نے بھگتا۔ اس طرح آٹھ سال بعد میں اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے اخلاق و مذہب سے بغاوت کر کے نظام روداد میں انتشار پیدا کر دیا تھا اور اس انتشار کا ایک مجرم ترین شکار میں تھا!

بملا حسین تھی۔ اس کا گناہ اگرچہ آٹھ سال پرانا ہو چکا تھا لیکن اب بھی نئے گناہ کی ترغیب دینے کی اس میں قوت موجود تھی۔

"آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے اپنی مترنم آواز میں پوچھا۔"

"بہت دور سے میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں"

دفعتہ چوکیدار اندر آیا اور بولا۔

"بملا جی آپ کو بابو جی نے بلایا ہے"

بملا مجھ سے معذرت کر کے چلی گئی میں پھر تنہا رہ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میں ایک نہایت ہی بیوقوف انسان ہوں۔ اتنی دولت لئے تمام دنیا میں ایک مجہول اور بدکردار عورت کو تلاش کرتا پھرا۔ مجھے اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے کیوں نہیں اس دولت سے خود فائدہ اٹھایا۔ کیوں نہیں میں اپنے کام میں لایا۔ کون سی چیز مانع تھی۔ ہیرے چرائے ہوئے نہیں تھے۔ دنیا میں کسی کو بھی علم نہ تھا کہ میرے پاس ہیرے

ہیں۔ یہ کونسا قانون تھا۔ یہ کس زبردست شے کا استبداد تھا جس نے مجھے اِن زرین ارادوں سے باز رکھا۔

بھاگ مجید اب بھی بھاگ۔ دولت اب بھی تیری جیب میں اور راز سینے میں۔ اب بھی کچھ نہیں گیا۔ چلدے۔

دنیا میں بیوقوف زیادہ ہیں۔ سنکر بھی۔ بیوقوف تھا تو بھی بیوقوف ہے۔ اب بھی عقل مند بن جا۔ یہ میری زندگی میں بڑا نازک لمحہ تھا۔ ایسے ہی مواقع پر قانون الٰہی کی پکڑ تربیت یافتہ کیریکٹر کی گرفت کا مظاہرہ ہوا کرتا ہے۔ میں ہل نہ سکا گویا میرے پیر زمین نے پکڑ لئے تھے۔

بلا پھر آگئی۔ کچھ پریشان میں نے طمع کے دوسرے حملے سے بچنے کے لئے اِس سے اپنی تمام رام کہانی جلدی سے کہہ ڈالی۔ شنکر کی اِس عنایت اور میری اِس "زحمت" کا حال سنکر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں نے جلدی سے بٹوا اُس کے سامنے خالی کر دیا۔ ہیروں نے میری حماقت پر ایک آخری قہقہہ لگایا جس سے تمام کرہ جگمگا اُٹھا۔ میں نے بلا کو رسید دی اور واپس ہیرے اس میں بھر کر اس کے حوالے کئے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں اب تک کئی من وزن کے نیچے دبا ہوا تھا اور اب ایسا ہلکا ہو گیا ہوں کہ ہوا میں اڑا جا رہا ہوں۔ جب میں دروازہ تک پہونچا تو مجھے دفعتہً ایک خیال آیا۔ واپس اندر آیا اور بلا سے پوچھا۔

"غالباً تم کو یہ بٹوا تو مجھے دینے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔ میں اِس کو یادگار کے طور پر رکھونگا۔"

"میرا خیال ہے آپ ایک ہیرا بھی اس میں سے لے لیجئے"
اُس نے سب سے چھوٹا ہیرا میری طرف بڑھا کر کہا۔
"نہیں صرف بٹوا چاہیئے مجھے"
میں بٹوا لیکر چلدیا۔
دو سال کے بعد میں ایک دفعہ لاہور کے سینما میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے دُور داہنی طرف ایک عورت نہایت زرق برق ساڑھی باندھے ہوئے نظر آئی۔ بھلا تھی اُس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔ نہ معلوم کون شنکر کی دولت دنیا کی ایک مختصر سی آبادی کو شاد کر رہی تھی۔
اچھا اَب اجازت چاہتا ہوں۔ ہاں یہ عرض اور کر دینا چاہتا ہوں کہ قدرت نے مجھے اس سَن کر دینے والی ایمانداری کے صلہ میں ایک ہزار روپیہ ماہوار کی نوکری دلا دی ہے لیکن میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ ہیرے بیچ کر زیادہ پر آسائش زندگی گذار سکتا تھا یا اَب گذار رہا ہوں"۔ اچھا خدا حافظ"
"ایمانداری کی حد کر دی اس شخص نے" میں نے کہا۔
"حماقت کے درجہ تک" ناصر نے جواب دیا۔
"اِنسان بعض اوقات غیر شعوری طور پر ایسے ہی جذبات میں مبتلا ہو جاتا ہے"
اِتنے میں حامد صاحب بھی آموجود ہوئے۔ رَونی صورت لئے ہوئے
"کیوں خیریت ہے؟"
میں نے دریافت کیا۔

"اماں چندرا ٹھاکر صاحب کی لڑکی نہیں ہے۔" اُس نے افسردگی سے کہا۔

"پھر؟" ناصر نے دریافت کیا۔

"پھر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ محض ایک طوائف ہے۔ کاش میں نے بلا پر ڈورے ڈالے ہوتے تو دولت ہاتھ لگتی۔"

"سچ کہتے ہو۔" ہم نے کہا۔

اَب حامد بملا کی دَولت کے تعاقب میں ہے؛ مجید اِس مسئلہ پر غور کررہا ہے کہ وہ ہیرے بیچ کر پُرآسائش زندگی بسر کرسکتا تھا۔ یا نوکری کرکے مطمئن ہے۔ ٹھاکر صاحب دولت کھو کر اور پھر اس کو پاکر اپنے بوڑھے دماغ سے سوچ رہے ہیں کہ پھر کس طرح وہی رعنائی و دم خم پیدا کریں۔ میں دولت کے کرشموں پر کبھی ہنستا ہوں اور کبھی رونے کی سعی مستحسن کرتا ہوں اور آپ؟ آپ مذہب و اخلاق کا مطالعہ کیجئے اور توفیق عمل کے لئے دُعا

[illegible]

میرے پیارے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ادا [illegible]

[illegible]

ادا [illegible] پیار [illegible]

اور [illegible] جب [illegible] دیکھا [illegible]

اور [illegible] ادا [illegible] سے

اور [illegible] جب [illegible] اپنا [illegible] آئی

پیار [illegible] دکھایا پیار ایسا [illegible]

[illegible] اپنے آپ کو ذلیل [illegible] جس [illegible]

حال میں سے پیار اگر آتا ہے جس طرح [illegible]

بندے سے پیار اگر آیا ہے اس طرح [illegible]

پیار اگر [illegible] اگر آپ آتے [illegible]

[illegible]

آپ نے لکھا ہے، مگر میرے خیال میں آپکو میرے اوپر جو زور کا
کرنا چاہیے تھا
پھر آپ کہتی کہ

شادی برباد

شادی خانہ آبادی

(سرگزشت)

پلیٹ

[illegible] to

This is a very good book. Every boy and girl must read this. I liked this book. It is very well. We can learn something from this book. Because every one halle to face some difficulties in this mortal world in ~~his~~ their life. So we can learn from those books which are like this book, how a man can face the difficulties of his life and how he can be a brave man in his life. Fahmida

Thank you, 8/8/67

O.K.

جہاں مستقبل اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ وہاں اندھیرے میں اپنا سایہ بھی پرایا ہے۔ ٹھوکر کھا کر گر گیا ہے تو سہارا دینے کوئی نہیں۔

(عِقاب)

ایک فلاکت زدہ میاں بیوی کا جوڑا پناہ کے لئے دربدر مارا مارا پھر رہا تھا لیکن خدا کی وسیع زمین میں اس کو کہیں ایک شب بسر کرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی تھی۔

کیا یہ عالیشان محل اور بلند ایوان صرف اِس لئے ہیں کہ اُن کو قہقہوں سے ہی ہردم آباد رکھا جائے؟ کیا یہ اس لئے نہیں ہیں کہ کوئی ٹوٹا دل ان کے اندر آکر آرام کی ایک ٹھنڈی سانس بھی بھر سکے؟ چونے اور پتھر کے ان باترتیب تودوں میں چنگ و رباب کی حکومت ہے اور اُن کے گلی اور کوچے خانماں بربادوں کی آوارہ گردی کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ تہذیب کی تباہ سامانی کا اِصرار ہے کہ مہذب بننا چاہتے ہو تو اپنے ہی تہذیب آشنا حلقہ میں گردش کرو۔ تم سے پست تر جو مخلوق ہے وہ صرف اِس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس تاریک پس منظر سے تم اپنی ارفع پوزیشن کی رفعت کا احساس کر سکو۔ لیکن کیا ان بلندیوں تک نحوست کے بھوت کبھی نہیں پہونچتے ہیں؟ کیا اِن مرتفع مکانوں میں غم کے خونخوار دانت نہیں چبھتے؟ کیا اُن فلک بوس محلوں سے کبھی نالہ و بکا کی صدائیں بلند نہیں ہوتیں؟ ہوتی ہیں ع

پچغد نوبتِ می زند بر گنبدِ افراسیاب

"مجھے اپنا تو خیال نہیں ہے۔ سوچ یہ ہے کہ تم بہت تھک گئی ہو۔ اب تم کو کہاں لئے لئے پھروں؟" بوڑھے نے اپنی بڑھیا سے کہا۔

"اور میں یہ سوچتی ہوں کہ تم کو میرے سبب سے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

"زیادہ فکر اس کی ہے کہ بادل تُلا کھڑا ہے۔ اگر مینہ برس پڑا تو تمہارا کیا حال ہوگا۔"

"جو تمہارا سو میرا۔" بڑھیا نے اپنے بڈھے کی تسکین کرتے ہوئے کہا ———۔

"اس شہر میں تو کوئی پُوچھے گا نہیں۔ کوئی آس پاس گاؤں ہو تو اس میں کیوں نہ چلے چلیں۔" بڈھے نے کہا۔

"جیسی تمہاری مرضی۔" دونوں کپکپاتے ہوئے اور بارش سے خوف کھاتے ہوئے شہر کے باہر آ گئے۔

"لاؤ یہ اپنی گٹھڑی بھی مجھ کو دیدو۔ بوجھ لگ رہا ہوگا۔" بوڑھے نے کہا۔

"جوانوں کی سی باتیں نہ کرو۔ کیا کیا لادو گے اپنے اُوپر۔ اچھا تو گدڑی مجھے دیدو۔ لاؤ۔"

"گدڑی میں ایسا کونسا بُوجھ ہے۔ ایک تو تم تھکی ہوئی ہو پھر گٹھڑی سر پر رکھ لی ہے۔ لاؤ۔ نہیں دونوں چیزوں کو لا دلوں۔"

"اچھا تو اپنی گڑ گڑ ی تو میرے حوالے کردو ۔ تھکے ہوئے تم بھی ہو کیا کیا اپنے اوپر لادو گے؟"

"بڑھیا نے اپنے بڈھے کے ہاتھ سے گڑ گڑ ی لے لی اور دونوں اُفتاں وخیزاں ایک گاؤں کی طرف چل دیئے ۔

تھوڑی دیر کے بعد اَبر اور گہرا ہو گیا ۔ بجلی چمکنے لگی ۔ اور ہوا میں تیزی پیدا ہو گئی ۔ اندھیرا ہو چکا تھا ۔ بڑھیا نے اپنے بڈھے کا سہارا لے رکھا تھا اور اس وقت اِس بے گھر جوڑے کو دیکھکر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جب تک ایک دوسرے کی معیت میں ہے اُن کو کوئی فکر لاحق ہو سکتی ہے ۔

دونوں ایک دوسرے کی زندگی کا سہارا تھے ۔ بے اِلتفات زندگی نے اُن کو اس حالت تک پہونچا دیا تھا لیکن اُن کی سہل کوشی نے حیات کی صعوبتوں کو بہت بڑی حد تک فرو کر دیا تھا ۔ مصیبت تو احساس مصیبت کی صورت گیر ہوتی ہے ۔

"نصیبن میرے ہاتھ پر پانی کی بُوند پڑی ہے ۔ اگر مینہ آگیا تو تیرا کیا حال ہوگا "

کسی پیڑ کے نیچے کھڑے ہو جائیں گے "

"یہ گھنٹہ دو گھنٹے کی برسات تھوڑی ہے ۔ رات بھر کی مُصیبت ہو گی ۔ یہ تو رُت ہی ایسی ہے ۔ مجھے یاد پڑتا ہے ایک دفعہ اس راستے میں میں نے ایک پُرانا مندر دیکھا تھا خدا کرے وہ اب بھی برقرار ہو ۔ برسات کی رات بسر کرنے کے لئے بُری جگہ نہیں ہے "

"تو مینہ تو آگیا اور تمہارا مندر ابھی نہیں آیا۔ ذرا جلدی جلدی پاؤں اُٹھاؤ" بڑھیا نے اپنے افسردہ ہاتھوں سے بڈھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

موٹی موٹی بوندیں پڑنی شروع ہو گئی تھیں۔ گھرے ابر کی وجہ سے شام کا منہ شب دیجور میں تبدیل ہو گیا۔ دونوں راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں گرتے پڑتے مندر کی تلاش میں چلے جا رہے تھے۔ زمین تو اِن غریبوں پر تنگ تھی۔ اَب آسمان بھی ستم ڈھانے لگا۔

گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے چکر کے بعد خدا خدا کر کے مندر کے قریب پہنچے۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ دونوں بھیگ گئے تھے اور سردی سے اُن کے نحیف جسم کپکپا رہے تھے۔ یہ مندر کیا تھا۔ ایک دو منزلہ شکستہ عمارت تھی۔ جس کا بالائی حصہ کچھ گر چکا تھا اور بقیہ حصہ ایک شدید بارش کا منتظر تھا۔ نیچے کے حصہ میں سخت تاریکی تھی۔ مگر جو لوگ حیات کی تاریکیوں سے نہیں ڈرتے اُن کے لئے ایسی تاریکی کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

"تجھے ٹھنڈ لگ رہی ہو گی نیعبن۔ باہر جا کر دیکھتا ہوں۔ خدا کرے سوکھی لکڑیاں درختوں کے نیچے مِل جائیں تو کام چل جائے" یہ کہکر بڈھا لکڑیاں چنتے باہر چلا گیا اور بڑھیا اندھیرے میں موسلادھار مینہ سے بچی ہوئی بیٹھی رہی۔ دفعتہً اس کو اپنی کوٹھری کی چھت پر پہلے تو ہلکا سا دھماکا سنائی دیا۔ پھر ایسی آواز آئی گویا کوئی اُوپر ٹہل رہا ہو۔ اوّل تو وہ ڈری مگر پھر اُس کو خیال آیا کہ ممکن ہے اُوپر کے حصہ میں بھی اُن کی طرح کوئی بارش سے پناہ

گزین ہو۔

جب بڈھا باہر سے لکڑیاں لیکر آیا تو اُس نے اپنے شوہر سے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اُس آواز کی جانب اُس کو بھی متوجہ کیا۔ بڈھے نے پہلے تو آگ جلائی جس سے یہ مختصر سی کوٹھری روشن ہوگئی۔ اُس کے بعد بڑھیا سے بولا " تو ذرا میری گڑگڑی میں تمباکو جما میں اُوپر جاکر دیکھتا ہوں "

" مگر دھیرے دھیرے سیڑھیوں پر چڑھنا ایسا نہ ہو کہ اُوپر کوئی دشمن ہو اور تم کو دیکھ لے "

بڈھے نے اپنے بوسیدہ جوتے اُتار ڈالے اور دَبے پیر زینے پر گیا۔ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ اُوپر ایک اور شکستہ کوٹھری ہے جس کی ایک دیوار گر چکی تھی اور دوسری میں بھی جا بجا شگاف ہو رہے تھے۔ اِتنے میں زور سے بجلی چمکی تو بڈھے نے دیکھا کہ ایک مَرد اور ایک عورت ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اُس نے کان لگا کر اُن کی باتیں سُننی شروع کیں۔ عورت سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

" شنکر تم نے اِتنا لکھا پڑھا یونہی ضائع کیا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر میں تم سے شادی کر لوں تو تم پھر بھی مجھ سے پریم کرتے رہوگے۔ میرا تو خیال ہے کہ کچھ دن بعد ہی ہم ایک دوسرے سے سیر ہو کر بیٹھ رہیں گے "

مگر کملا تم نے اس پر بھی غور کیا کہ ہم ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ شادی کس طرح ہماری محبت کا خاتمہ

کر دے گی۔"

"میری ہم جماعت شیلا کا تجربہ ہے کہ اس نے پچاسوں نوجوانوں سے محبت کی لیکن اس کے دل میں یہ آرزو کبھی قائم نہیں ہوئی کہ سماج کے بنائے ہوئے قانون یعنی بیاہ کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ کر ایک کی ہی ہو رہے۔ ہم کیوں نہ جب تک بن سکے محبت کی زندگی گزارتے رہیں اور جب سیر ہو جائیں تو علیٰحدہ ہو جائیں۔"

"لیکن ہماری اولاد کا کیا حشر ہو گا؟"

"اولاد ہونے ہی کیوں دی جائے۔"

"مگر اس کا ہونا لازمی ہے۔"

"تم بالکل قدامت پرست ہو۔ شادی کیا ہے؟ جنسی خواہشات کی تکمیل کی ایک قانونی شکل ہے۔ یہ ایسا قانون ہے جس کا پابند کوئی سمجھدار انسان اپنے کو نہیں بنا سکتا ہے۔"

آخر تم بیاہ سے کیوں ڈرتی ہو؟"

تم سے پچاس بار کہہ تو دیا کہ شادی ہماری محبت کا آخری باب ہو گی۔ جب ہمارے اس جوانی کے خون کا ہیجان کچھ کم ہو جائے گا تو ہم دونوں محبت کے باب میں سرد ہو کر رہ جائیں گے۔"

"لیکن کملا کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ شادی یا محبت صرف جنسی لذائذ کے لئے ہے۔ کیا مرد و عورت کے باہمی اتصال کے اور کچھ معنی نہیں ہو سکتے۔ کیا ان کے ملاپ کا کوئی اور مقصد نہیں ہے؟"

"اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جوانی ہوتی ہی اس لئے کہ اُس کو بغیر اندیشہ فردا دونوں ہاتھوں سے لٹایا جائے اِس کے بعد انحطاط شروع ہوتے ہی زندگی کا خاتمہ کر لیا جائے۔"

"تمہارے خیالات بہت باغیانہ ہیں۔"

"اور تم بہت قدامت پرست ہو۔" اِتنے میں مینہ اور تیز ہو گیا۔ کوٹھڑی کے ٹوٹے ہوئے حصّوں میں بوچھار تیزی سے اندر آ رہی تھی، جس سے دونوں بھیگ رہے تھے۔

"شنکر نیچے چلو یہ مینہ تھمتا نظر آتا نہیں ہے۔ یہاں تو ہم بالکل تر ہو جائیں گے۔"

بڈھا یہ سُنکر چھپے سے اُلٹے پیر نیچے اتر آیا اور آ کر اطمینان سے اپنی گڑگڑی پینے لگا۔

"کون ہے اُوپر؟"

"دو پاگل نوجوان مرد و عورت ہیں۔ خدا جانے کیا بک رہے ہیں۔ لڑکی کہہ رہی ہے کہ میں بیاہ نہیں کروں گی، کنواری رہ کر ہی بیاہی کی سی زندگی گزاروں گی اور جوان کہہ رہا ہے کہ گرہست میں آ جا۔ اور جانے کیا کیا بک رہے ہیں وہ لوگ۔ ابھی شاید وہ نیچے ہی آنے والے ہیں۔ وہاں وہ بھیگ رہے ہیں۔"

اِتنے میں زینے پر چاپ ہوئی اور پہلے عورت اور بعد کو مرد نیچے آیا۔ اُنھوں نے جو روشنی دیکھی اور اِس مدھم اُجالے میں اِس بوڑھے جوڑے پر نظر ڈالی تو اُن کو بہت تعجب ہوا۔ دونوں اُن کے قریب آئے اور نوجوان

نے بڈھے سے دریافت کیا " تم بھی شاید ہماری طرح یہاں پناہ لینے کے لئے پڑے ہوئے ہو۔ یہ بڑھیا کون ہے۔ کیا تمہاری بیوی ہے؟"

" اور کیا میں تمہاری طرح اس بڑھیا کو بھگا کر لایا ہوں " بڈھے نے جواب دیا۔

" بھگا کر؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہم بھاگے ہوئے ہیں؟ " لڑکی نے اپنی مترنم آواز میں پوچھا۔

کیونکہ نہ تمہارے ساتھ کچھ اسباب ہے نہ کپڑے۔ ہمارے پاس اپنی گدڑی اور گٹھڑی وغیرہ تو ہے " بڑھیا نے کہا۔

" بکتی ہے تو " لڑکی نے تیکھے پن سے جواب دیا۔

" لاؤ بی بی ذرا تمہارا ہاتھ تو دیکھوں "

" میرا ان خرافات پر اعتقاد نہیں ہے "

" ہاں جب تم شادی بیاہ کو بیکار سمجھتی ہو تو دوسری گیان کی باتوں کی کیوں پرواکرنے لگیں " بڑھیا نے کہا۔

" تجھے کیسے معلوم ہوا کہ میں شادی بیاہ کو بیکار چیز سمجھتی ہوں " لڑکی نے دریافت کیا۔

" یہ تو تیری صورت پر لکھا ہوا ہے "

" بڑی آئی میری صورت پڑھنے والی۔ شنکر میں بھیگنا پسند کرونگی لیکن ان لوگوں کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرسکتی "

" بیٹھ جاؤ بیٹی۔ ہم اتنے بُرے لوگ نہیں ہیں۔ ہاں ہمارے اندر

کمی ہے تو اُس کی ہے کہ ہم تمہاری طرح سچی باتوں کو جھٹلانا نہیں جانتے میری نصیبن بہت کم جھوٹ بولتی ہے اور میں بھی " بڈھے نے کہا۔

" بڑے میاں یہ بڑھیا کب سے تمہارے پاس ہے؟ " لڑکی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ شنکر بھی ایک کونے میں اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

" کب سے پاس ہے؟ دیوانی بچی کیا تیرے خیال میں یہ میری کوئی ——— کوئی آشنا ہے "

" آشنا پر خدا کی مار " بڑھیا نے درمیان میں بول کر کہا۔

" ارے ہم بھی کبھی تم دونوں پاگلوں کی طرح جوان تھے۔ لیکن ہم نے ایک دوسرے پر خواہ مخواہ عاشق ہو کر بیاہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ہمارے ماں باپ نے ہماری شادی رچائی تھی کہ یہ کام اُن کو کرنا تھا تاکہ میں جوان ہو کر آوارہ نہ ہو جاؤں جیسی کہ آج کل کی لڑکیاں ہو رہی ہیں۔ ہمارا بیاہ اِس لئے کیا گیا تھا کہ ہم میاں بیوی جیون میں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے ساتھی بنے رہیں۔ آج ہماری عمریں ڈھلے مدّت گذر گئی لیکن نہ تو میں نے اپنے میاں کے پاس سے بھاگنے کی کبھی کوشش کی اور نہ اُس نے میرے سوا کسی کو چاہا " بڑھیا نے کہا۔

" ہاؤں ہاؤں ہاؤں " بڈھے نے ایک لمبی جمائی لی۔

" سو جاؤ نا منہ کیوں پھاڑ رہے ہو بُری طرح۔ گدڑی ڈال دوں تمہارے پیروں پر؟ " بڑھیا نے اپنے بڈھے کو نیند کی حالت میں دیکھ کر کہا۔

"تو بھی سو جا، یہ پانی تو جانے کب تھمے گا" بڈھے نے نصیبن سے کہا۔

غرض تھوڑی دیر میں دونوں سو گئے۔

"کیسے عجیب و غریب لوگ ہیں یہ کملا" شنکر نے طویل خاموشی کے بعد کہا۔

"بیحد عجیب" کملا نے ازخود رفتگی کے عالم میں جواب دیا۔ وہ اِس بوڑھے جوڑے کی اِس زندگی سے بیحد متاثر ہو رہی تھی۔ بہت دیر تک کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی۔ آخر شنکر سے بولی۔ "شنکر اس مصیبت کے مارے گر بسر ور جوڑے کو کس قدر ایک دوسرے کا پاس ہے۔"

"حالانکہ ان کی شادی کو نصف صدی کے قریب گذر چکی ہوگی۔ لیکن یہ اب بھی میاں بیوی بنے ہوئے ہیں۔" شنکر نے اس کو متاثر دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

"میں یہی سوچ رہی ہوں۔ یہ کیوں نہیں ایک دوسرے سے بیزار ہوتے ہیں۔ ان میں تو شادی سے پہلے باہم محبت بھی نہ تھی۔"

"کملا! اِنسان جس قدر خواہ مخواہ فلسفی بنتا ہے اُسی قدر وہ اپنی زندگی اَجیرن کر لیتا ہے۔ ان لوگوں نے کبھی زندگی کے اُن غیر ضروری مسائل پر غور ہی نہیں کیا جو آج کل تہذیب جدید کے جزو اعظم بنے ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے زندگی کو وہی سمجھا جو وہ ہے، وہ نہیں سمجھا جو وہ بنا دی جاتی ہے۔"

"چھوڑو اِس قصہ کو۔ یہ بتاؤ کیا تم بھی مجھے اسی طرح چاہتے رہوگے۔ جس طرح یہ لوگ بڑھے ہو کر بھی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

"بولو بولو شنکر اگر میں سماج کے اِس بندھن کو جس کو تم شادی کہتے ہو قبول کر لوں تو کیا تم ہمیشہ میرے ہی ہو کے رہوگے اور مجھ ہی سے محبت کرتے رہوگے ؟"

"نوجوان کملا۔ اِنسان کی عمر محض محبت کے لئے ہی وقف نہیں ہے۔ یہ دیوانگی کا دَور تو بہت ہی کم عمر ہے۔ دُنیا میں ہم کو اور بھی کام کرنے پڑتے ہیں۔ اور دیگر فرائض کی بھی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ہمدردی باہم، پاس، فرض، غمگساری وغیرہ وغیرہ۔ اِس بوڑھے جوڑے میں جو تم اب محبت کے دُھندلے نقوش دیکھ رہی ہو وہ دراصل باہمی غمخواری اور رفاقت کے جذبات ہیں اور یہی جذبات حقیقی ہوتے ہیں۔ میں اور تم جب بڑھے ہو جائیں گے تو ہم کو بھی دوسرے باغی قسم کے نوجوان ایک دوسرے کا رفیق بنا دیکھ کر اِسی طرح رشک کیا کرینگے۔"

"تو پھر مکان پر چلو ہم باقاعدہ اپنے والدین کی رضامندی سے جائز طور پر شادی کی کوشش کریں گے۔ ابھی تو ہم کو گھر سے نکلے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی ہے۔ مکان پر بہانہ کر دیں گے کہ سینما گئے تھے۔"

"مگر بارش تو اب تک ہو رہی ہے۔"
شنکر نے کہا۔

"پرواہ نہیں اِس آج کی مبارک شب کی یادگار کو قائم رکھنے

کے لئے ہم کو جھیگنا چاہیئے ۔ میں چاہتی ہوں شنکر اس بوڑھے جوڑے کو بھی معلوم ہو جائے کہ ہم بھی اُن جیسی زندگی اختیار کرنے والے ہیں "

" اس کے لئے پھر وقت نکالیں گے " یہ کہکر شنکر کملا کو بارش میں اپنے مکان کی طرف لیکر روانہ ہو گیا ۔

بزرگ لوگوں سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ع

خوش آنکہ تو ترک خط فانی بکنی
تدبیر بقای جاودانی بکنی
کوشش بکنی و ہرچہ بتوان دانست
دانی لیس ازاں ہرچہ بدانی بکنی

F
5/8/

شادی مبارک ہو

گناہ کی یادگار

(زندگی کے میلے)

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہوں گے
اک دن پڑے گا جانا۔ کیا وقت کیا زمانہ۔ کوئی
نہ ساتھ دے گا۔ سب کچھ یہیں دھرا رہ جائے گا، ہم اکیلے
یہ زندگی کے میلے

دنیا ہے موجِ دریا۔ قطرے کی زندگی کیا۔ پانی میں
مل کے پانی انجام یہ کہ فانی۔ دم بھر کو سانس لے لے
یہ زندگی کے میلے

کم ہوں گے یہ بہاریں، الفت کی یادگاریں
کم

انجام

Don't feel this,
Never oh dear, Because God is

"ھیرو سے میں بچپن ہی سے محبت کرتا تھا۔ میرے دوست نے دوسری سگریٹ سلگا کر کہا۔

"میں اس کو پیار سے ھیرو کہا کرتا تھا۔ کیسی سیدھی سادھی، کس قدر بھولی بھالی لڑکی تھی۔ وہ بھی مجھ سے بہت مانوس تھی۔ اور کہا کرتی تھی کہ میں اپنا دولہا زیدی ہی کو بناؤنگی۔

کئی سال سے فصل اچھی نہیں ہو رہی تھی۔ والد کے انتقال نے اور بھی مالی پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نوجوان تھا لیکن اتنی محنت و جفاکشی نہیں کرسکتا تھا۔ جس قدر والد مرحوم کرلیا کرتے تھے۔ جب کاشتکاری میں ہم کو متواتر نقصان ہونے لگا تو مجبوراً میں دوراہی کی مختصر بستی کو چھوڑ کر قصبہ فیض آباد جا بسا۔

غلہ کی میرے پاس کمی نہ تھی لیکن انسان محض اناج کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آج کل کھانے پینے میں اتنا صرفہ نہیں ہوتا جتنا دوسری خرافات میں ہوجاتا ہے۔ آخر میں نے اپنا اناج جو چچا کی تحویل میں تھا بیچ ڈالا۔ یوں چند روز گذار دیئے۔ ھیرو کا گھرانا بھی گاؤں سے منتقل ہو گیا تھا۔ معلوم

نہیں وہ لوگ کدھر چلے گئے۔ بہر نوع مدت تک مجھے بہرو کی کوئی خبر معلوم نہیں ہوئی۔

تعلیم کا تعلق جہاں تک کتابوں سے ہے میں نے اس قسم کی تعلیم کم حاصل کی تھی۔ ہاں عملی تعلیم میں آج کل کے گریجویٹوں سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ میرے اندر آج کل کے پامال نصاب لڑکوں کی سی کم ہمتی، بے اعتمادی خود فروشی نہیں تھی۔ میں کسی قسم کی محنت و مزدوری سے نہیں شرماتا تھا۔ میرے اندر جھوٹا گھمنڈ، اکڑ اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی جہالت نہیں تھی۔ پھر بتائیے میری تعلیم مکمل تھی یا آج کل کے طلباء کی مکمل ہے؟

وہ ماہر لسانیات ہو کر بھی کچھ نہیں کما سکتے۔ وہ تمام دنیا کی ہسٹری پڑھ کر بھی اپنے کیریکٹر کو اسلاف کا نمونہ نہیں بنا سکتے۔ وہ تمام عالم کا جغرافیہ جان کر بھی اپنے ملک کی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ وہ سائنس کے منتہی ہو کر بھی ملکی آلاتِ کشاورزی اور دیگر کام کی ایجادات سے قاصر ہیں اور میں اپنی ملکی زبان، محض وطن کی تہذیب اور فقط دیہاتی کلچر سے واقف ہوتے ہوئے ان سے زیادہ کما لیا کرتا تھا میں ان سے زیادہ کارآمد عنصر تھا، اُن سے زیادہ غیور، باحمیت، مخلص اور باہمت تھا۔“

یہاں پہنچکر میرا دوست رُک گیا۔ اس کے چہرے پر کسی قدر خفت کے آثار پیدا ہو گئے۔ میں نے اس کے اس فوری تغیر کو حیرت سے دیکھا۔ اور قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ دریافت کرتا اس نے کہنا شروع کیا۔

”مجھ سے لیکن ایک اخلاقی لغزش سرزد ہو چکی ہے۔“

ہیں

دُنیا اپنی بداعمالیوں اور بُرے کرتوتوں کو چھپا کر بھی اچھی بنی رہتی ہے مگر میں اپنی اس خطا کو خطا ہی کہتا ہوں۔ سُنتے جاؤ۔ آگے جا کر میں اس کا ذکر کروں گا۔ اچھا تو میں کہہ رہا تھا تم سے؟ ہاں یہ کہ مجھے مدت تک بھروکی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔"

میں نے اپنی رقم جو اناج سے حاصل ہوئی تھی لہو و لعب میں نہیں اُڑادی تھی بلکہ ایک تجارتی ادارہ میں لگا دی تھی اور خود مزدوری کر کے پیٹ پالتا تھا۔"

میں نجابت و خاندانی شرافت پر ناز کرنیوالوں میں سے نہیں ہوں لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اچھی ہڈی کا قائل ضرور ہوں۔ فیض آباد میں ایک چودہری صاحب کے ہاں ترکاریوں کی کاشت ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنی کیاریوں کی دیکھ بھال اور آبیاری کے لئے نوکر رکھ لیا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی چھپریا بھی کھیت کے ایک کنارے پر بنالی تھی۔

اپریل کے مہینے تھے۔ گرمی کی وہ شدت تھی کہ الاماں۔ گویا آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ لُو کے تند جھونکے تیزی سے آتے اور ہری ہری لہلہاتی کیاریوں پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پانی کے سرد سینے پر سے پھسلتے اپنی جھلسن اور جہنمیت کو قدرے کم کرنے کے بعد کبھی میرے چھپر کو لے اڑتے اور کبھی میری آنکھوں میں مٹی، تنکے جھونک کر بھاگ جاتے۔ دن بھر کا تپتا ہوا سورج جب تمام نواح کو بھٹی کی صورت میں چھوڑ کر غروب ہوتا تو میں شام کو اپنی چارپائی باہر گھسیٹ لاتا اور ٹھنڈی کیاریوں کے درمیان

بچھا کر کبھی چرس کی مترنم چڑ چوں چڑ چوں اور اس کے ساتھ چرس والے کے دیہاتی نغموں کو سنتا اور کبھی کیاریوں کے ٹھنڈے پانی میں دن بھر کی سخت گرمی سے لو کھلائی ہوئی ننھی ننھی چڑیوں کے نہانے کا تماشا دیکھا کرتا۔ تھوڑی دیر بعد باغبان۔ پانی دینے والا۔ اور چرس والا اپنے اپنے کام کو ختم کرکے میرے پاس آبیٹھتے اور دو ایک چلم اور دو چار بیڑی پی کر چلے جاتے۔

جب سے میں نے یہاں کے کاروبار کو سنبھالا تھا ہر ترکاری غیر معمولی "تندرست" پیدا ہونے لگی تھی۔ میں کیاریوں کی سنبھال کے فن سے واقف تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ چودھری جی کبھی کبھار میرے پاس آبیٹھتے تھے اور باتوں باتوں میں میری محنت و جفاکشی کی داد دیئے جاتے تھے۔ کچھ دن بعد اُن سے بالکل گھر کے سے تعلقات ہو گئے۔ اکثر کھیر، دودھ دہی وغیرہ مجھے ملنے لگا اور بعض وقت کھانا بھی۔

چودھری صاحب کی ایک لڑکی بھی تھی۔ اچھی خاصی جوان و تندرست گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، مضبوط ہاتھ پیر اور سخت جلد۔ غرض جسقدر ایک محنتی دوشیزہ تندرست ہو سکتی تھی۔ وہ بھی تھی۔ نہ تو وہ نزاکت کا مجسمہ تھی نہ غرور و تمکنت کا مرقع ——— بھولی بھالی، بناوٹ سے بیگانہ، عشوہ گری سے ناآشنا۔

ایک روز میں کچھ شلجم اکھیڑ کر ان کو بیٹھا ہوا دھو رہا تھا کہ عیدن (چودھری جی کی لڑکی) آگئی اور اپنے تلوؤں کو ٹھنڈک پہنچانے کے لئے پانی کے اس

گڑھے میں آکھڑی ہوئی جس میں شلغم دھو رہا تھا۔

"کیا کر رہے ہو؟" اس نے پانی میں چھپ چھپ کر کے پوچھا۔

"تمہیں نظر نہیں آتا کہ کیا کر رہا ہوں؟" میں لڑکیوں سے ہمیشہ اسی روکھے پن سے پیش آنے کا عادی تھا۔

"شلغم دھو رہے ہو؟" اس نے پھر سادگی سے پوچھا۔

"نہیں بھٹے بھون رہا ہوں۔"

"مجھے تھوڑے سے شلغم چاہئیں۔"

"پیسے لاؤ۔" میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹک کر جواب دیا۔

"پیسے تو نہیں ہیں۔" اس نے اس انداز سے کہا جس کا مقصد یہ تھا کہ چیز تو ہماری ہی ہے پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔

"تو شلغم بھی نہیں ہیں۔"

"دیدو صاحب" وہ بولی۔

"نہیں صاحب۔"

"مجھ سے بھی پیسے؟"

"اچھا یہ بتاؤ یہ منگوائے کس نے ہیں؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تم اپنے لئے لے جا رہی ہو؟"

"ہاں اچار ڈالوں گی۔"

"ادھر چودھری جی میرا جو اچار ڈالدینگے۔"

"تم ہنسی کرتے ہو۔ دیدو۔ میں کسی سے نہیں کہونگی"

"عیدن" میں نے ایک خاص لہجہ میں کہا۔

"ہاں" اُس نے میری بدلی ہوئی آواز سے چونک کر کہا۔

"تمہارا بیاہ کب ہوگا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ شرما گئی۔

"لو لونہ" اس نے منہ پھیر لیا۔

"اچھا تو یہ ہی بتادو کہ کس سے ہوگا؟"

"میں کیا جانوں" اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میں نے سُنا ہے کہ چودھری جی تم کو کلّو کے حوالہ کر رہے ہیں" کلّو ان کا بھتیجا تھا۔ مزید تعریف نام ہی سے ظاہر ہے۔ وہ چپ ہوگئی۔

"کلّو کیا اچھا لڑکا ہے۔ لمبا چوڑا۔ موٹا تازہ۔ گورا چٹا" گورا چٹا کہنے پر اُس کو ہنسی آگئی۔ دوپٹے کا پلّو منہ میں ٹھونس کر اس نے منہ پھیر لیا۔

"تم اس کو پسند کرتی ہو؟ میں کسی سے نہیں کہوں گا مجھ سے کہہ دو۔"

"نہیں" اُس نے افسردگی سے جواب دیا۔

"کیوں؟" وہ بیچاری چنان وچنیں نہیں جانتی تھی۔ اُس کی ناپسندیدگی کا سیدھا سا جواب "نہیں" تھا یہ "نہیں" اس لئے کہ اُس کا سادہ و معصوم دل کلّو کو نا معلوم کیوں پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ خود نہیں جانتی تھی۔

"کلّو تمہیں اچھا معلوم نہیں ہوتا؟"

"نہیں" اس نے پھر اسی سادگی سے جواب دیا۔

"اور میں؟" میں نے شلجم کے پتّوں سے اُس کے سر پر جھاڑو سی دیکر

پوچھا۔ اِس بار وہ بہت لجا گئی اور پانی سے باہر نکل آئی "مجھے شلجم دیدو" وہ صرف اِس قدر کہہ سکی۔

"دیتا ہوں۔ پہلے میرے سوال کا جواب دو" وہ بالکل چپ چاپ کھڑی رہی۔

"اچھا تو یہ بتاؤ کہ کیا میں بھی کلّو کی طرح تم کو بُرا معلوم ہوتا ہوں؟"

"نہیں" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"یعنی میں تم کو اچھا لگتا ہوں؟"

"ہاں" جس سوال کا جواب پہلے وہ دینے میں شرما رہی تھی اُس کا جواب آخر جذباتِ پسندیدگی میں دی۔

عیدن۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ تم مجھے پسند کرتی ہو۔ لو اَب تم بھی اِس خبر کو سُنکر خوش ہو جاؤ کہ تمہاری شادی میاں کلّو سے نہیں ہو رہی ہے بلکہ مجھ سے ہوگی۔ سُنا تم نے؟"

پہلے تو وہ سمجھی کہ میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب اس نے مجھے سنجیدہ دیکھا تو اس کے سادہ چہرے پر ایک مسرّت کی لہر دوڑ گئی جو فوراً ہی شرم کی سُرخی میں منتقل ہوگئی۔ اُس کے بعد اُس نے اپنا بے ترتیب دوپٹہ سنبھالا اور شلجم کا مزید تقاضا کئے بغیر اِس طرح میرے سامنے سے بھاگ گئی جس طرح ایک ہندوستانی کنواری اپنے منگیتر کے سامنے سے بھاگ جاتی ہے۔

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ چودھری صاحب عیدن کی نسبت میرے ساتھ طے کر چکے تھے۔ جس کا علم اُس کو نہ تھا۔ ہمارے ہاں اکثر لڑکیوں کو

This story is very Good

اپنے شوہر کے حالات سے اِس طرح نابلد رکھا جاتا ہے۔ گویا وہ اُن کا زبردست دشمن ہے۔

میرا انتہائی جوانی کا عالم تھا۔ ہر شئے جوان نظر آ رہی تھی۔ ہر لمحہ رنگین گناہ کی دعوت دے رہا تھا۔ کسی لطیف جوانی کو دیکھ کر جی مچلنے لگتا تھا کہ اپنا شباب اِس میں جذب کر دوں۔ ایک چمار کی لڑکی جو ہمارے جانوروں کے پاس سے غلاظت وغیرہ ہٹانے پر نوکر تھی اس قدر بیدردی سے جوان تھی کہ اُس پر نظر پڑنے کے بعد ہوس کاری کے تند شعلے اِس درجہ ملتہب ہو جاتے تھے کہ اُن کی تسکین کا سامان بجز اس کے کچھ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ اِس شباب مجسم عورت کو اپنے کنارِ معصیت میں جذب کر لیا جائے۔ اُف اس کی جوانی پاپ کا ایک ایسا اُمڈا ہوا طوفان تھا جو غیر حقیقی تقویٰ اور فہم کی عمارت کو بہا دینے کو کافی سے زیادہ تھا!

ایک روز شام کو میں اپنی جھونپڑی کی طرف آ رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اُس لڑکی کو چند غنڈوں نے گھیر رکھا ہے اور وہ اُن سے رہائی پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بدمعاش بھاگ گئے چنانچہ بغرض احتیاط میں اُس لڑکی کو اُس کی جھونپڑی تک پہونچا آیا۔

اُس کی اندھی ماں بڑی ہی احسان مند ہوئی جب اُس کو معلوم ہوا کہ میں اس کی لڑکی کو بدمعاشوں سے چھٹکارا دلا کر لا رہا ہوں جب میں چلنے لگا تو لڑکی منت پذیری کے طور پر باہر آگئی۔ چوطرف اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے وقت اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ لڑکی نے میرے کوٹ کا دامن

پکڑ لیا۔ میں نے سنسنی اور حیرت کے درمیان اُس کو چھڑانے کی کوشش کی تو اُس نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے خون میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ وہ میرے قریب آ گئی اور قریب ہو گئی، اِس کے بعد میرے سینے سے نسوانی جوان سینے کی قیامت متصل ہو کر میری ہستی کو جلائے ڈال رہی تھی۔ معاذ اللہ۔

میں آدھ گھنٹے کے بعد جو وہاں سے لَوٹا ہوں تو تمام دُنیا اَندھیری نظر آ رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا میں تاریک گناہوں کی غلیظ اور گھناؤنی گہرائیوں میں پھسل گیا ہوں، گویا میں ایک تند شراب پی کر بدمست ہو گیا ہوں۔

اِس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد مجھے چچا کا خط مِلا کہ ہماری پُرانی زمینیں بحال ہو گئی ہیں اور مجھے فوراً وہاں پہنچ جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں چودھری صاحب سے اِجازت لے کر اپنے پُرانے گاؤں دوراہی آ گیا۔ چودھری جی نے نہایت افسوس کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ اُن کے گھرانے میں دو تین اَموات ہو چکی تھیں جس کی وجہ سے عیدن کے ساتھ میری شادی برائے چندے مُلتوی ہو گئی تھی۔

مجھے فیض آباد آئے تین سال سے اُوپر عرصہ ہو چکا تھا۔ اِس عرصہ میں میں نے اپنی محنت و جفاکشی سے ایک معقول زمینداری قائم کر لی تھی نہایت آرام سے بسر ہو رہی تھی۔

ایک روز مجھے ایک گندہ سا خط ناگری زبان میں لکھا ہوا مِلا۔ میں نے

تعجب سے اس کو کھولا۔ پڑھا۔ کئی بار پڑھا۔ عجیب وحشت خیز مضمون تھا۔ میں بھوچکا سا رہ گیا۔

یہ خط اُس چمار لڑکی کی اندھی ماں نے کسی سے لکھوا کر مجھے روانہ کیا تھا۔ اول تو میرا نام اور پتہ معلوم کرنے میں جو اس کو دشواریاں پیش آئی تھیں اُن کا رونا رویا تھا۔ اِس کے بعد ایک مہیب انکشاف۔ وہ یہ کہ جمّو (اس کی لڑکی) بوقتِ وضع حمل مرگئی ہے ـــــــ اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا ہے جو اَب سوا تین سال کا ہے۔ وہ لکھتی تھی کہ میری زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ لہٰذا میں آکر اپنی اَولاد کو لے جاؤں۔

اَولاد؟ بیشک وہ لڑکا میرا ہی ہے۔ یا اللہ! اَب؟ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی کبھی نہ آئی تھی کہ ایسا ہوگا۔ ایسا ممکن ہو سکے گا۔ ایک لغزش لذیذ کا خمیازہ!

میرے چچا کیا کہیں گے! چودھری صاحب کیا کہیں گے!! عیشؔ دن کیا کہے گی!!! زمانہ کیا کہے گا؟ پھٹکار، لعنت، تُف! میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ ایک پٹھان چمار کے گھر! پھر کیا عیدن میری اِس خطا کاری کو معلوم کر کے مجھ سے شادی کرے گی؟ ہرگز نہیں۔ میں اُس کی محبت سے بھی گیا۔ وہ مر کیوں نہ گیا مردود۔ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گیا۔ اُس کی قحبہ ماں نے اس کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا۔ میں اپنی حماقت کا اِنتقام جمّو کو کوس کر لینے لگا۔

مَرنے دو سب کو۔ سب جہنّم میں جاؤ۔ وہ بڑھیا بھی غارت ہو۔ وہ لونڈا بھی

خدا کرے۔ مرجائے۔ ہاں اُس کو مرجانا چاہیئے۔ مجھے دُنیا کی لعنت سے رہائی دلانے کے لئے اس ناجائز اولاد کو مرجانا چاہیئے۔ مجھے پھر مسرت کی زندگی گذارنے کے لئے اِس غیر شرعی بچے کے مرنے کی دُعا کرنی چاہیئے۔ وہ مرجائے مرجائے۔ وہ خدا کرے مرجائے۔!

میں گھنٹوں دل میں دعائیں مانگتا رہا۔ پہروں پریشان و مغموم بیٹھا رہا۔ بہت سوچا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بہرحال فیض آباد جانا ضروری ہوگیا تھا۔ دوسرے روز روانہ ہوگیا۔ چودھری صاحب سے بھی نہیں ملا۔ سیدھا اُسی چماری کے گھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ تھوڑے فاصلہ پر چند بچے کھیل رہے ہیں۔ کبھی ادھر دوڑ گئے۔ کبھی اُدھر دوڑ گئے۔ اُن کے پیچھے ایک تین سال کا بچہ بھی ہے۔ لو وہ گر پڑا۔ پھر لنگڑاتا ہوا اُٹھکر چلدیا یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہی ہے۔ اس کا وہ پیرا سا کھلتا ہوا رنگ۔ وہ اُونچی پیشانی۔ وہ پٹھان ٹائپ کی ناک۔ بیشک یہی ہے وہ لونڈا۔

میں اُس کی طرف بڑھا۔ یہ لنگڑا کیوں رہا ہے۔ اُف یہ جنگجو نسل کا بچہ سڑے ہوئے جانوروں کی کھال اُدھیڑا کرے گا۔ یہ پیش پا اُفتادہ لوگوں کی سی زندگی گذاریگا! یہ تہذیب و تعلیم۔ عیش و تنعم۔ آدمیت و انسانیت سے ہٹ کر جانوروں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے گا!! ایک معصوم بچہ! جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اُس کی پیدائش کا رازِ تاریک اُس کے سیاہ کار باپ کی ایک گھناؤنی اور شرمناک غلطی میں پوشیدہ ہے۔ خطا باپ کی اور وہ بے گناہ پاداش بھگتے!

لو وہ ایک لڑکے سے لڑنے لگا اور اُس کو پیٹ کر چل دیا۔ لیکن یہ اِس قدر لنگڑا کیوں رہا ہے؟ کیا اُس کے پاؤں میں چوٹ لگی ہوئی ہے؟ یہ سوچتا ہوا اُس کے قریب پہنچا۔ اور بچے تو مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ گئے مگر وہ ڈٹا رہا۔ اور اپنی کنجی آنکھوں سے جن میں معصومانہ تحیر نظر آرہا تھا مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کا ننھا سا ہاتھ تھام لیا اور جس طرح ہر مرد اپنی پہلی اولاد کو ایک خاص دلچسپی سے دیکھتا ہے میں نے بھی اس کو دیکھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟ میں نے اس سے محبت سے پوچھا۔

"گھیسو" اُس نے معصومانہ کہا۔ میں نے اِستکراہ سے منہ بنا لیا۔ ابھی کیا ہوا ہے ابھی تو نام ہی گھیسو ہے چند سال بعد اُس کا کام مُردہ جانوروں کی کھال اُتارنے کا ہوگا۔

میں نے جھک کر اُس کے ننھے سے پاؤں کو دیکھا۔ سُوج رہا تھا۔ بُری طرح متورم تھا۔ اور ایک میلی کچیلی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جس پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ میں نے اُس کو مٹھائی کے لئے کچھ پیسے دیئے۔ اور بازار جاکر پٹی کے لئے سفید کپڑا مرہم اور دیگر ضروری اشیاء لاکر اندھی عورت کو دے آیا اور اُس کو ہدایت کر آیا کہ روزانہ کسی سے زخم دھلوا کر پٹی باندھ دیا کرنا۔ میں دو چار روز بعد آکر اُس کو دیکھ جاؤں گا۔

یہاں سے رخصت ہو کر میں چودھری صاحب کے ہاں چلا گیا۔ اور اُنہی کا مہمان رہا۔ میں روز شام کو اپنے بچے کو دیکھ آتا تھا۔ چودھری صاحب پُوچھتے تو کہہ دیتا کہ شفا خانہ چلا جاتا ہوں میرا ایک دوست بیمار ہے۔

بچے کا زخم بجائے اچھا ہونے کے اور زیادہ خراب ہو گیا۔ چنانچہ میں نے مجبوراً اس کو قصبہ کے شفاخانہ داخل کرا دیا۔ یہاں آکر زخم کے صدمے سے اس کو بخار ہو گیا۔ اور ایک، دو گھنٹے کے بعد تو اس کی حالت نازک ہو گئی۔ میں اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اس کا سرخ رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھیں بند کئے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ اس کے کراہنے سے خود بخود میرے کلیجے پر چوٹ سی لگتی تھی۔ وہ تکلیف سے منہ بناتا تو میرے دل میں درد ہونے لگتا۔ میں نے اس کو جھک کر پیار کیا۔ اُف اس کا چہرہ بخار سے کس قدر گرم ہو رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سر کو تھپتھپانے لگا۔ بچے! اگر تیرے باپ نے بھی تجھ سے آنکھیں پھیر لیں تو تو در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔ تیری حیات آئندہ نہایت المناک ہو گی —— دفعتہً کوئی کمرہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں سمجھا نرس ہو گی۔ بغیر دیکھے بولا "دیکھو اس کی خوب دیکھ بھال کرو۔ میں تم کو انعام دونگا۔"

"مگر یہ کس کا بچہ ہے؟ پیچھے سے کسی نے پوچھا۔

"میرا ہے اور کس کا ہوتا۔" میں نے مڑتے ہوئے پیچھے دیکھ کر جواب دیا —— اور سہم کر رہ گیا۔ چودھری صاحب تھے۔

"یہ تمہارا بچہ ہے؟ تمہارا؟ کیا کہہ رہے ہو؟" انھوں نے بے انتہا حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں یہ میرا ہے۔ یہ میری ناجائز اولاد ہے۔ چودھری صاحب یہ میرے گناہ کی یادگار ہے۔"

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ناجائز اولاد؟ کس کے بطن سے؟" اُنھوں نے حیرت سے چیخ کر دریافت کیا۔

"یہ معلوم کرنے کی آپ کو ضرورت نہیں" میں نے کہا۔ پھر بولا "اِس کو آپ ایک چماری کے بطن سے سمجھ سکتے ہیں"

"زیدی اگر عیدن سے شادی کرنا ہے تو اس گناہ کی پوٹ سے کنارہ کر و"

"چودھری صاحب کیا میں اس امر کو جانے دوں۔ اپنی اولاد کو اپنی مسرتوں پر قربان کردوں؟"

"ہاں ایسی اولاد کو مرجانا چاہیئے جس کو سوسائٹی ناجائز سمجھتی ہو"

"معاف کیجئے میں اِس بیگناہ بچے کو کسی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا۔ رہی عیدن تو وہ اپنے گھر خوش رہے"

"لیکن صاحبزادے اگر خدانخواستہ یہ زندہ رہ گیا تو اِس چماری زادہ کی دُنیا میں وقعت کیا ہوگی؟"

"بس خاموش رہیئے۔ میں دُنیا کی ذہنیت کو خوب سمجھتا ہوں۔ اگر یہ چمار زادہ جوان ہوکر کوئی بڑا آدمی بن گیا تو دولت وحُسن اُس کے قدموں پر ہوگا"

اِس واقعہ کو دس برس ہو گئے۔ میرا فہیم گیارھویں برس میں لگ گیا تھا۔ میں اس کو اسکول میں داخل کرا کے واپس اپنے گاؤں میں آگیا تھا۔

منزہیں

ایک روز شام کو میں اپنے کنویں پر نہا رہا تھا کہ ایک عورت پانی بھرنے آئی۔ مٹکا وزنی تھا۔ اُس نے مجھ سے سہارے کی درخواست کی۔ مٹکا اونچا کرتے وقت میری نظر اس عورت کے چہرے پر پڑی تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا "کون مہرو!" اس نے بھی چونک کر مجھے دیکھا۔ دونوں اِس ملاقات سے ایسے بے اختیار ہوئے کہ مٹکا ہاتھ سے چھوٹ گیا" اور ہم کو نہلاتا ہوا زمین پر گر کر چُور چُور ہو گیا۔

"تم کب آئیں مہرو؟ اور اب تک کہاں رہیں؟" میں نے بچوں کی طرح اس کے گیلے ہاتھ تھام کر کہا۔

"تین چار دن ہوئے۔ تم تو زیدی بوڑھے نظر آنے لگے" اور تم کونسی جوان نظر آرہی۔ میری طرح تم بھی بڑھیا ہوگئیں۔ تمہارا میاں کہاں ہے؟"

"اللہ کے گھر" اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"تمہارے بال بچے ہیں کچھ؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں ایک بچّہ ہے لیکن اس کی ماں نہیں ہے" "کیوں کیا تمہاری بیوی بھی مر گئی؟" اُس نے کسی اُمید سے دریافت کیا۔

"بیوی تھی ہی کب"

"پھر بچہ کہاں سے آگیا؟"

"بس سمجھ جاؤ" میں نے ہنس کر کہا۔ اس کے چہرے پر بھی برائے چندے آثارِ نفرت پیدا ہوگئے اور وہ حقارت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اِتنے میں

یرا فہیم مجھے ڈھونڈھتا ہوا آگیا۔ مہرو نے جو اس خوبصورت بچے کو دیکھا تو تعجب سے پُوچھا "یہ کس کا لڑکا ہے؟"

"میرا" میں نے فخر سے کہا۔ فہیم نے مہرو کو اس طرح دیکھا گویا اُس کی ماں وہی تھی۔ اور مہرو بھی اس کو اِس طرح پیار کی نظروں سے دیکھ رہی تھی گویا وہ اسی کی کوکھ سے پیدا ہوا تھا۔ جب یہ دونوں ماں بیٹے بننے کے لئے تیار تھے تو مجھے مہرو کو اپنی بیوی بنا لینے میں کیا عذر تھا۔

only for those who loves God them but also who had to love Rabi you.

Zahid Radia [illegible]

رضيّه

~~[illegible]~~

[illegible]

١٢٥

اگر آپ برا نہ مانیں - تو میں ایک
عرض کرنا چاہتا ہوں -

کیا آپ نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے
اگر کیا ہے، تو کس سے کب سے، (ناول سے،
(پڑھ ا بجے اِن (حلیمی) کا ڈرامہ سے)

آپکو معلوم ہے کہ کیا ہوا سی اِک
کتاب پر لکھا ہے، آپ نے آجکل کے
زمانے میں پیار کی کمائی ہے

نہ میں نے آپ کو دیکھا ہے نہ تم نے
ہم کو دیکھا ہے، پھر بھی ہم کو تم سے
پیار ہو گیا ہے

اسپھا شرف اپنا
(مرزا پور ...
علمدار

اے رضیہ!

میرا افسانہ پڑھنے سے میرے تن و توش میں اسی طرح ~~...~~ ارتعاش پیدا ہوا۔ جس طرح آپ خاموش جھیل میں کنکر پھینکنے سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔

تمہارا عاشق، رضیہ مجید

روزانہ علی الصباح سیر کے لئے گھر سے نکل جانا میرا معمول تھا۔ سیر کیا تھی اچھا خاصہ سفر کرلیا کرتا تھا۔ چھ سات میل دور شہر سے باہر نکل جاتا اور آفتاب طلوع ہوتے ہوتے واپس لوٹ آتا تھا۔ اکثر چلتے چلتے درود شریف یا سورۂ یٰسین پڑھتا رہتا تھا اور میرا خیال ہے اس میں مجھے کافی محویت رہتی تھی۔

آج صبح جو اٹھا تو گہرا ابر تھا اور دھیمی دھیمی خنک ہوا چل رہی تھی۔ بارش کے پچھلے دن تھے ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ خود رَو پودوں کی بھینی بھینی بُو، خوش و بشاش پرندوں کی کلیلیں، مست تیتریوں کی بے تکان آنکھ مچولی اور دُور بستی میں سے کبھی کبھی کسی سحر خیز انسان کے گانے کے غیر مسلسل الاپ سے معلوم ہوتا تھا کہ آج دنیا بہت مسرور ہے۔ یہ سماں ایک مرتاض کو خود بخود مائل عبادت و تحمید کر رہا تھا لیکن میرے مضمحل دل میں اب بھی خون شباب کے چند قطرات باقی رہ گئے تھے جنہوں نے اس فضا کی تحریک سے رگوں میں ایک ہنگامی حرارت پیدا کر دی تھی۔ میں نے تسبیح کو جیب میں رکھا اور دل کو اپنے اس وقت کے تمام رجحانات

سے متکیف ہونے کی اجازت دیدی۔ جب مذہب کا پاک وزن طبیعت پر سے ذرا کم ہوا تو خواہ مخواہ غالب صاحب کی یاد آنے لگی۔ بے اختیار میں

نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

گنگنانے لگا۔

ہر جہت سے میرے کانوں میں آوازیں آرہی تھیں کہ تیری موجودہ زندگی کے علاوہ ایک معصوم، سبک اور خوشگوار زندگی یہ بھی ہے جسکی اس وقت تو آزادی سے سانس لے رہا ہے۔ دُنیا اتنی تاریک جگہ نہیں ہے جتنی تو اُس کو سمجھے ہوئے ہے۔ یہ بھی رہنے کے قابل مقام ہے۔

اَب میں ایک ویران سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ سوچ بچار کی پریشان کُن گہرائیاں، فلسفہ کی اُلجھنیں، اور چناں وچنین کے دماغ سوز مسائل سے میں اس وقت قطعاً خالی الذہن تھا۔ یہ وقت ہر انسان پر ضرور کبھی نہ کبھی آنا چاہیئے۔ اس مد وجزر سے عمریں کیف زا بنتی ہیں۔ اِس اُتار چڑھاؤ سے زندگی ہموار رہتی ہے اور اسی نشیب وفراز کے سہارے ہم آلام حیات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنے رہتے ہیں۔

میں آس پاس کے چھوٹے چھوٹے پودوں کے سروں پر پیار سے چھڑی پھیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ بھی میری اس حرکت سے خوش تھے اور مجھ سے کھیل رہے تھے۔ کبھی میری چھڑی کو پکڑ لیتے اور کبھی دامن کو جب یہ مشغلہ غیر دلچسپ ہو گیا تو میں نے چھڑی کو زور زور سے گھمانا شروع کیا۔ اَب میری تمام کوشش اِس میں صرف ہو رہی تھی کہ میں اپنی چھڑی سے

مسلسل دس بارہ چکّر بنا سکوں۔ افسوس اس میں اچھی طرح کامیابی نہیں ہوتی تھی چھڑی کبھی ہاتھ سے نکل جاتی تھی اور کبھی دامن میں اُلجھ جاتی تھی۔ اس شغلہ میں مجھے یہ تجربہ ہوا کہ کوئی نہایت قوی چیز میرے پیچھے سے آکر لگی۔ اس قدر زور سے کہ میں بُری طرح زمین پر گر پڑا ——— اس کے بعد کا مجھے ہوش نہیں۔

ایک ہفتہ تک میں اس جمیل دُنیا سے جس کو چند یوم پہلے میں نے نہایت مسرور چھوڑا تھا کسی ایسے مقام میں رہا کہ جہاں مجھے اپنے گرد و پیش کا ذرا ہوش نہ تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اسی خوش باش دنیا کو میں نے نہایت خشمگین و قہر آلود پایا۔ میرا تمام بدن چکنا چور تھا۔ میری بوٹی بوٹی درد کر رہی تھی اور دو ایک جگہ سے میری ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ کئی روز کے بعد میں بمشکل یہ معلوم کر سکا کہ جس جگہ پڑا ہوا ہوں وہ بالکل اجنبی ہے۔ اس کی در و دیوار اس کی تمام فضا، اس کے تمام مکین میرے لئے بیگانے ہیں۔

یہ آخر کیا اسرار تھا؟ میں نے بولنا چاہا مگر مجھے خود نہیں معلوم کیا زبان سے نکلا۔ میں نے کچھ سننا چاہا لیکن معلوم نہیں کیا سنا۔ مجھے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں تمیز نہیں تھی کہ یہ دن ہے یا رات۔ میرے لئے تو ہر وقت مسلسل رات تھی۔ دو ایک بار میرے کانوں نے کچھ نغمہ کی قسم کی آواز کا احساس کیا، کبھی وہی آواز پیانو جیسے ساز میں بدل جاتی تھی اور کبھی میں اس کو قرآنی قرأت میں منتقل پاتا تھا!

چند روز بعد جب میری حالت ذرا بہتر ہوئی تو میں ایک دن صبح کا

احساس کیا اور اُس کے ساتھ ہی ایک بوڑھی عورت کو اپنے سرہانے پایا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ میں فلاں مقام پر سے بیہوش اُٹھایا گیا ہوں۔ مجھے وہاں ایک بھینس مسلسل کچل رہی تھی۔ میری دو پسلیاں اور دو جگہ سے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور سر میں بھی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اچھا تو یہ بھینس صاحبہ کی عنایت تھی۔ لیکن میں نے اُن محترمہ کا کیا بگاڑا تھا کہ اُنھوں نے مجھ پر یہ شفقت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری چھڑی کے چکروں سے بدکی تھی، میں اپنے دلچسپ شغلہ میں اِس قدر محو تھا کہ خطرہ کا احساس نہ کر سکا۔ اور کچل دیا گیا۔

یہ مکان ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس کا تھا۔ اور وہی مجھے بھینس کے سینگوں سے چھڑا کر یہاں لائے تھے۔ یہ بڑی بی اُن کی اہلیہ محترمہ تھیں اور شب و روز مادرانہ محبت سے میری غور و پرداخت کر رہی تھیں۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اِس کے بعد پھر سو گیا۔

دوپہر کو میری آنکھ ایک ہلکے لمس نے پھر کھولدی۔ میں نے دیکھا کہ دو شخص میرے سرہانے جھکے ہوئے ہیں معلوم ہوا کہ اُن میں سے ایک ڈاکٹر ہے اور دوسرا صاحب خانہ۔ ڈاکٹر نے میری پٹیوں کو سنبھالا۔ کیفیت دریافت کی نبض دیکھی۔ دوا دی۔ اور چلا گیا۔ اور سپرنٹنڈنٹ صاحب وہیں بیٹھ گئے۔ اِس کے بعد میرا نام اور پتہ وغیرہ دریافت کیا۔ "آپ کی جیب سے کوئی شئے ایسی برآمد نہیں ہوئی جس سے آپ کا کچھ نشان مِل سکتا۔ ہاں ایک تسبیح، کچھ روپئے اور دو ایک نسخے تو ہاتھ لگے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ وظیفی

بھی ہیں اور بیمار بھی۔" اُنھوں نے ہنسکر فرمایا۔

میں نے اُن کی نوازش و اکرام کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔

"میں پہلے بیمار تھا۔ نسخے اُسی زمانے سے میری جیب میں پڑے ہوئے ہیں۔ اچھا اب میری گذارش ہے کہ مکان پر پہنچا دیا جاؤں۔ میرے شہر میں عزیز و اقارب تو کوئی نہیں ہیں، ہاں دو ایک دوست ہیں جن کو میں اعزا سے زیادہ چاہتا ہوں۔ براہِ کرم اُن کو آپ اِس حادثہ سے مُطلع فرما دیجئے۔ وہ غریب میرے اِس طرح اَچانک غائب ہو جانے سے سخت پریشان ہونگے۔"

"خیر میں اُن کو تو اِطلاع دیدونگا۔ مگر ابھی آپ کے شہر میں جانے کے میں خلاف ہوں۔ دیکھو بھائی میں بہت بے تکلف اِنسان ہوں۔ اگر تم کو اَحباب کے پاس یا اپنے مکان پر یہاں سے زیادہ آرام اور تازہ ہوا مل سکتی ہے تو میں تم کو نہیں روکتا۔ لیکن اگر تم محض ازراہِ تکلّف یہاں سے چلے جانا چاہتے ہو تو میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری موجودگی یہاں کسی پر بار نہیں ہے۔ اگر کسی کو تمہارے متعلق شکایت ہوئی تو میں تم کو خود یہاں سے بھگا دونگا۔ ابھی تم اس وقت تک یہیں رہو جب تک چلنے پھرنے کے قابل نہ ہو جاؤ۔"

اِن مُربیانہ و بزرگانہ الفاظ کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ یہاں مجھے ہر قسم کا آرام تھا لیکن اس خیال سے بڑی کوفت ہوتی تھی کہ میں ایک اَجنبی کو اپنی عیادت کی تکلیف دے رہا ہوں۔

دوسرے روز میرے دوست و احباب اور تنا سا سب ہی چلے آئے

اور میری حالت دیکھکر بہت مغموم ہوئے۔ واحد لیکن سب سے زیادہ پریشان ہوا۔ ایک وہی میرا یارِ قدیم تھا۔ چلتے وقت میں نے چپکے سے اُس سے کہدیا کہ سپرنٹنڈنٹ صاحب نہایت مخلص و مہربان انسان ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں یہاں سے جاؤں۔ چنانچہ اب ایسی کوشش ہونی چاہیئے کہ میری علالت کا بار ان پر نہ رہے۔ واحد نکتہ کو سمجھ گیا۔ اُس نے ایسی ترکیب نکالی کہ میرا بار اِن اجنبی لوگوں پر نہ پڑنے پائے۔ غرض ہم برائے چندے یہاں رہ پڑے۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ایک گاؤں خرید لیا تھا۔ وہ اکثر اُس کی دیکھ بھال کو چلے جاتے تھے۔ اُن کے بعد گھر پر اُن کے چھوٹے بھائی رہا کرتے تھے اس گھر میں علاوہ نوکروں کے میں نے زیادہ افراد کو نہیں پایا۔ اُن کی اہلیہ تھیں۔ دو چار بچے تھے ——— اور معلوم نہیں کون تھا۔

میرے ماؤف دماغ نے بحالتِ نیم غشی جو نغمات و تلاوت سُنی تھی وہ وہم نہ تھا۔ میں اکثر صبح کے وقت نہایت شیریں آوازمیں آیاتِ قرآنی سُنا کرتا تھا اور دوپہر کو پیانو کے نغمے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس مکان میں بھی کوئی انسان میری طرح موجود تھا جس پر کبھی تقدس کے دورے پڑتے تھے اور کبھی زندہ دلی کے۔

آواز کی جاذبیت اور آیات کی صحیح قراءت اتنی موثر تھی کہ میں مشکل یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ اس آواز کو میں حصولِ ثواب کے لئے سنوں یا حظِ سمع کے لئے ! ہاں اتنا ضرور ہوتا تھا کہ اس آواز کو سُنکر میری بھی رگِ وظیفہ خوانی

پھڑک اُٹھتی تھی اور میں بھی چپکے چپکے سورۂ یٰسین پڑھنے لگتا تھا۔

بعض دن ایسا بھی ہوتا کہ نہ تلاوت کی آواز آتی نہ پیانو کی۔ اس روز مجھے تمام دن ایک قسم کی اُلجھن سی رہتی۔ لیکن میں نے کبھی وہ حرکت کرنے جرات نہیں کی جیسی میرے ایک دوست نے میرے افسانہ ''ٹھوکر'' میں کی ہے۔ وہ بڑی غیر شریفانہ حرکت تھی۔

کبھی اندر کمرے میں بچّوں کی چیخ پکاریں اُسی آواز کو ایک تہدید شیریں کی شکل میں بھی سُن لیا کرتا تھا لیکن یہ نہ معلوم ہوسکا کہ وہ ''کس نفرِ حلق'' سے نکلتی ہے۔

بارش اَب تقریباً ختم ہی ہو چکی تھی۔ لیکن اَب بھی کبھی کبھی اَبر گھِر آتا تھا اور میری جراحت پر آنسو بہاتا ہوا گذر جاتا تھا۔ جھولا جھولنے والے ترشح کے منتظر ہی رہتے تھے۔ صحن کے درخت میں جھولا ڈالا جاتا تھا اور میں اپنے کمرہ علالت میں پڑا ہوا کبھی کبھار کسی غیر معمولی اونچی پینگ کے طفیل میں کھڑکی میں سے کبھی پشت اور کبھی صرف کسی کا پلّو دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس گھر میں ضرور ایک ایسا بھی فرد تھا جس کو مجھ سے چھپایا جا رہا تھا یا جو مجھ سے چھپ رہا تھا۔ ہو نہو وہ فرد وہی قرآن خواں اور پیانو نواز تھا!

دوسرے روز واحد کے ساتھ میرے دوسرے شناسا بھی مجھے دیکھنے آ گئے۔ یہ سب لوگ نہایت خوش ذوق و شُستہ مذاق تھے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بھی اُس روز یہیں تھے۔ ادبیات و شاعری کا چرچا چھڑ گیا۔ میری حیرت کی اِنتہا نہ تھی جب میں نے اُن کا کلام سُنا۔ اُن کی

نغز گوئی اور بلند خیالی داد سے بے نیاز تھی۔ اور اُن کی حیرت کی بھی انتہا نہ تھی جب اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا فرشی مہمان مشہور افسانہ نگار رشید ہے۔ یہ چیز اب تک معرض گفتگو میں آہی نہ تھی۔ جب وہ اِس حقیقت سے باخبر ہوئے کہ وہ شخص جس کے افسانے اُن کو اور ان کے تمام گھر والوں کو سب سے زیادہ پسند ہیں اُن کا کشتۂ احسان مہمان ہے تو وہ اور زیادہ بے تکلف ہو گئے اور مجھ سے بیحد محبت کرنے لگے۔ اُن کے ہاں وہ تمام رسائل آتے تھے جن میں میرے حقیر افسانے چھپتے تھے اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ممکن ہے میرے افسانے قرآن خواں مستور کی نظر سے بھی گذرتے ہوں اور وہ بھی اُن کو پسند کرتا ہو۔ کیا اُس کو بھی معلوم ہے کہ رشید آج کل اُن کا مہمان بنا ہوا ہے؟ اگر اُس کو معلوم بھی ہو جائے تو وہ رشید کو اپنا جمال دیکھنے کی اجازت نہیں دیگا۔ کیونکہ وہ ایک مسلم گھرانے کا فرد لطیف ہے۔ ع

اللہ کرے حسن ستر اور زیادہ!

اسی طرح میں اُس سامعہ نواز آواز کو سنتا ہوا اچھا ہو گیا۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب مجھے رخصت ہونا تھا۔ اپنے مکان پر آکر جیسی بھی وحشت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ نہ وہ اب پیانو کے حیات بخش نغمے تھے نہ قرآن کی تقویٰ آفریں تلاوت۔ کان ان دونوں چیزوں کو ڈھونڈھتے تھے اور چشم خیال شب و روز اسی وجود مستور کی تلاش میں حیران رہتی تھی۔

سپرنٹنڈنٹ صاحب میرے صحت یاب ہو جانے کے بعد بھی کبھی کبھی میرے کلبۂ احزان پر قدم رنجہ فرما جاتے تھے۔ اور رضا تو (ان کا لڑکا جس کی عمر بمشکل سولہ یا سترہ سال کی ہوگی) دوسرے تیسرے روز آدھمکتا تھا۔ بڑا ذہین وخوش طبع لڑکا تھا۔ اس کی حسین سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں مستور کے جمال کی جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے صبیح رنگ میں میں "مخفی" کے نورِ عالم افروز کے پرتو سے تکلف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اس کی سادہ حرکات سے میں "پوشیدہ" کی پرکار اداؤں کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ میں نہ معلوم کیا کیا چاہتا تھا مگر چاہت کو اس کا ذرا احساس نہ تھا۔

دل کی عجیب کیفیت تھی کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ اگر لگتا تھا صرف سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلہ پر جہاں میں اب بہت کم جاتا تھا۔ سیر و تفریح میں بھی جی نہیں بہلتا تھا۔ قدم اٹھتے ہی نہیں تھے۔ اگر اٹھتے تھے تو اسی راہ میں جو بڑی پرصعوبت تھی۔

میں نے ایک عمدہ نسل کا گھوڑا خرید لیا اور جدھر وہ لیجاتا چلا جاتا۔ نہ منزل کا دھیان تھا نہ فرسنگ کا شمار۔ آوارہ گردی سے مطلب تھا بعض اوقات تو میں تیس تیس میل دور نکل جاتا اور رات کسی وقت گھر پر آپڑتا۔ چھ ماہ سے یہ تھا ہمارا معمول۔

ایک روز میں غیر معمولی طور پر بہت دور نکل گیا۔ شہر سے تقریباً چالیس میل دور۔ رات ہوگئی تھی اور سردی کی رات۔ ابر بھی ہو رہا تھا جس سے چوطرف غیر معمولی تاریکی پیدا ہوگئی تھی۔ آسمان ہر لحظہ دھمکی دے رہا تھا کہ اب مینہ پڑا۔

میرا گھوڑا کچی سڑک پر ڈلکی چل رہا تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے میں اُس کو سرپٹ نہیں دوڑا سکتا تھا۔ دیا سلائی جلا کر ٹائم دیکھا تو ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ ابھی منزل پچیس تیس میل دُور تھی۔

میں اسی طرح چلا جا رہا تھا کہ دفعتاً گھوڑا چمکا۔ میں نے اپنے کو سنبھالا اور اندھیرے میں دونوں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن کچھ نظر نہ آیا لیکن ایک دم بیچ سڑک میں دو لالٹین جگمگا اُٹھیں جن سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں اس کے بعد روشنی پھر گُل ہو گئی۔ اَدہو سڑک پر کوئی موٹر کھڑی تھی لیکن یہ کیا وقت سیر کا تھا۔ میں قریب پہنچا تو پھر ایکدم روشنی ہوئی اور اس کے ساتھ یہ آواز آئی۔ "ارے! رشید صاحب! بھئی خوب آئے۔ ہم تو یہاں محتاج بنے بیٹھے ہیں۔"

"ہیں! رضا۔ تم یہاں کہاں؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"کیا بتاؤں بھائی۔ شامت جو آئی تو میں آج خود کار لیکر نکل پڑا۔ تاکہ باجی کو خالہ سے ملالاؤں، وہاں کھانے وغیرہ میں ہو گئی دیر۔ راتوں رات مکان پر پہنچنا تھا کیونکہ صبح اَبا وہاں آجائیں گے۔ اُن سے اجازت لی نہیں تھی۔ اُن کے خوف سے شب ہی کو روانہ ہونا پڑا کہ کمبخت دونوں پہیئوں میں پنکچر ہو گیا۔ اَب کیا کریں۔ باجی بھی ساتھ ہیں۔ یہ اَندھیری رات، جنگل بستی سے دور۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ تم کو دیکھ کر بڑی تسکین ہوئی لیکن اس وقت تم بھی ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟" میں نے حیران ہو کر اندر نظر ڈالی

تو اور کسی کو بھی بیٹھا پایا۔ جس کو باجی کے لفظ سے ابھی نامزد کیا گیا ہے۔ کہیں وہ ہمارے تخیل میں بسنے والے دوست مستور صاحب ہی تو نہیں ہیں۔ ہاں وہی تھے۔ یا اللہ۔ یہ کیا مصیبت آئی۔ موٹر بالکل بیکار، سنسان جنگل، میلوں بستی کا پتہ نہیں۔ اب کیا ہوگا۔ خدانخواستہ کوئی درندہ یا مردم آزار لوگ نکل آئے تو کیسی رہے گی۔ میں سخت فکر میں پڑگیا۔ آخر میں نے رضا سے دریافت کیا۔" جس قصبے سے تم آرہے ہو وہ کتنی دور ہوگا؟"

"ہوگا ہی چالیس پنتالیس میل دور" رضا نے کہا۔

"تو گویا اب واپسی کا بھی امکان نہیں رہا۔ تم ہو نہایت نالائق۔ انکو کیوں ساتھ لے آئے۔ اگر لائے تھے تو صبح روانہ ہوئے ہوتے۔ اب زیادہ سے زیادہ چیخ پکار کر بیٹھ جاتے۔ اب تم مصیبت میں پھنستے تو پھنستے ساتھ ہی اُن کو بھی پھانسا۔ اگر ایسا ہی موٹر رانی کا شوق تھا تو تھوڑی ہی دور گھوم کر چلے آتے۔ اچھا اب تم جاتو۔ بندہ تو چلا" میں نے اس کو ستانے کو کہا۔

"اچھا۔ جاؤ بھائی۔ ہمارا بھی اللہ نگہبان ہے" رضا نے مایوسی سے کہا۔

"پاگل۔ میں اب کہیں تم کو چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ ہم دونوں یہیں مرینگے۔ مگر ان خاتون کا کیا حشر ہوگا۔

آپ نے بھی اس پاگل انسان کو اس وقت روانہ ہونے سے نہیں روکا۔ مجھے تعجب اس پر ہے" میں نے پہلی بار تاریکی میں مخاطب ہوکر کہا جس کے جواب میں صرف ایک کسمساہٹ ہوئی اور بس۔

"رضا۔ جی میں تو آتی ہے کہ تم کو سزا کے طور پر چھوڑ کر چلدوں اور سپرنٹنڈنٹ صاحب کو مع ایک موٹے سے ڈنڈے کے لے کر یہاں آؤں۔ مگر افسوس تمہاری بہن بھی ساتھ ہیں، اُن کی وجہ سے چُپ ہوں۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ کہ اپنا شہر یہاں سے کتنی دور ہوگا؟" رضا نے پوچھا۔

"ہوگا پچیس ۲۵ میل کا فاصلہ۔"

"تب تو واقعی مرے۔" رضا نے کہا۔

"اِنشاءاللہ" میں نے ہنسکر کہا۔

"اَب تو ڈر لگنے لگا اِس جنگل سے۔"

"شاباش بہادر نوجوان۔ تم ڈر رہے ہو تو تمہاری بہن کی تو خدا جانے کیا حالت ہوگی۔"

"کیوں باجی۔ تم کو بھی ڈر لگ رہا ہے؟"

"ہاں" آہستہ سے کہا گیا۔

"موٹر یہیں چھوڑ دیں اور تمہارے گھوڑے پر بیٹھ کر چلے چلیں" رضا نے کہا۔

"ہاں موٹر یہیں چھوڑ دیں اور پیدل چلیں" اُس کی بہن نے آہستہ سے اپنی تجویز پیش کی۔

"خوب۔ گویا پنچر ہو جانے سے یہ اس قدر بیکار ہوگئی ہے کہ کوئی اِس کو لیجانا گوارا نہیں کرے گا۔ اور یہ تو بتاؤ کہ تم میں سے ہے کسی میں ہمت

جو پچیس میل پیدل طے کرے؟" میں نے کہا۔

"تو پھر آخر کیا کریں۔ تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ" رضا نے کہا۔

"دیکھو میری تو یہ رائے ہے کہ آس پاس کسی بستی کو تلاش کریں۔ وہاں چل کر شب گذاریں اور وہاں سے بیل لاکر کار کو بھی وہیں گھسیٹ کر لے چلیں"

"لیکن کیا تمہارے خیال میں قریب میں کوئی گاؤں مل جائے گا؟" رضا نے پوچھا۔

"دیکھو میں تلاش میں جاتا ہوں تم ذرا دل قوی رکھو۔ ابھی لوٹ کر آتا ہوں" میں نے کہا۔

بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ایک معمولی سا سرج کا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ہوا چل رہی تھی سرد۔ رضا کے پاس صرف ایک کمبل تھا جس میں دونوں بہن بھائی لپٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ خیر میں خدا کے بھروسے پر چلدیا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی مسافت کے بعد ایک دس بارہ جھونپڑیوں کے گاؤں میں پہنچا۔ اسپ سوار کو دیکھکر غریب گاؤں والے ذرسے۔ میں نے خدا خدا کر کے دو بیلوں کا انتظام کیا اور ایک بہت مختصر سی جھونپڑی قیام کے لئے صاف کرائی۔

موٹر میں بیل جوتے گئے۔ بارش شروع ہوگئی تھی اس میں بھیگتے ہوئے رات کو گیارہ بجے کے قریب گاؤں میں آکر پہنچے۔ موٹر کی گدیوں کو جھونپڑی میں ڈال دیا۔ جس پر رضا اور اس کی بہن دراز ہوگئے۔ مینہ پڑنے سے

بلا کی سردی تیز ہو گئی تھی۔ اُس پر تند ہوا کے سرد جھونکے، کلیجے کے پار ہوئے جا رہے تھے۔ قیامت کی رات بھی غالباً ایسی ہی مصائب و تکالیف سے پُر ہو گی صرف ایک اعتبار سے یہ شب خوشگوار تھی میرا استور میرے پاس تھا۔

وہ دونوں بھائی بہن تو کمبل میں سکڑے پڑے تھے لیکن اپن جانب بالکل ہی غیر محفوظ تھے۔ بدقت تمام میں نے چند لکڑیاں اور کچھ اُپلے فراہم کئے اور آگ جلا کر کوٹھری کو گرم کیا۔ جب اس سے فراغت ہوئی تو تقاضۂ شکم کی طرف توجہ کی۔

"کیوں میاں رضا بھوک کا کیا حال ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"بھئی ہم لوگ تو کھانا کھا کر چلے تھے۔ تم اپنی کہو۔ تمہارا تو کچومر نکل رہا ہو گا مارے بھوک کے۔"

"کچھ نہ پوچھو۔ ایسی بھوک لگی ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ میں تم دونوں میں سے کسی کو کھا نہ جاؤں۔"

"گاؤں والوں سے کچھ مانگو نہ۔ شاید اُن کے پاس کچھ نکل آئے۔" رضا نے کہا۔

"یہ غلط بات ہے۔ مر جاؤں گا لیکن مجھ سے یہ نہ ہو گا۔" میں نے کہا۔

"عجیب آدمی ہو۔ پھر اور کچھ صورت نظر بھی تو نہیں آتی۔"

"بس روزہ۔"

"وہ اولٹین کے بسکٹ کہاں ہیں جو خالہ بی نے مُنّی کے لئے دئیے تھے۔

"مستور نے اپنے بھائی سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ بالکل اُن کا خیال ہی نہ رہا۔ لو دوست اب تم نہیں مَر سکتے۔ لیکن وہ تو باہر کار ہی میں رہ گئے۔ بھیگ کر آٹا ہو گئے ہونگے۔ میں ابھی لایا" یہ کہہ کر وہ فوراً بسکٹ لینے باہر بھاگ گیا۔ سب خراب ہو گئے تھے لیکن بھوک فرو کرنے کو کافی تھے۔

"اَب سونے کی کیا ٹھیری ؟" رضا نے جمائیاں لیتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں سو جاؤ۔ میں چوکیداری کرتا ہوں۔ اندھیری رات ہے۔ اور جنگل کا معاملہ ہے۔ ہم سب کو نہیں سو جانا چاہیئے" میں نے کہا۔

"آپ کے پاس کیا کچھ اوڑھنے کو نہیں ہے ؟" رضا کی بہن نے دریافت کیا۔

"مجھے ضرورت نہیں ہے۔ یہ آگ کافی ہے" میں نے عرض کیا۔

"آپ کمبل لے لیجئے۔ ہم لوگ برقعہ اوڑھ لیں گے۔ سردی کافی تیز ہے۔ آپ سکڑے جا رہے ہیں" پھر کہا گیا۔

"شکریہ۔ آگ مجھے زندہ رکھنے کو کافی ہے"

"یہ تو گھنٹہ دو گھنٹہ میں سرد ہو جائے گی۔ اس کے بعد کیا کرو گے ؟" رضا نے کہا۔

"صبر" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ برقعہ اوڑھ لیجئے" شرارتاً کہا گیا۔

"شکریہ۔ مجھے تو بے پردہ ہی رہنے دیجئے۔ آپ دونوں نازپروردہ

ہیں۔ آپ کو زیادہ آسائش کی ضرورت ہے۔ میں تو سپاہی آدمی ہوں۔ ہر طرح رات گذار سکتا ہوں؟

"نیند تو کیا آسکتی ہے۔ ویسے ہی دراز ہوئے جاتے ہیں ہم" لیکن رضا صاحب کی تو آنکھیں بند بھی ہو چکی تھیں۔

آگ کے مضمحل شعلے اس مختصر کوٹھری کو روشن اور گرم کر رہے تھے لیکن تند ہوا کے جھونکوں سے بار بار گل ہو جاتے تھے۔ کمبل میں سے دو انسانی سر نکلے ہوئے تھے۔ چاروں حسین آنکھیں بند تھیں۔ ایک چہرے پر اجنبی کی نظر سے اُس کو پوشیدہ رکھنے کو برقعہ کا پلو ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن باوجود اس حزم و احتیاط کے ہوا کے تیز جھونکے چہرے کو بے نقاب کر چکے تھے جو افسُردہ شعلوں کی دُھندلی روشنی میں نظر آجاتا تھا۔

میں نے اشتیاق سے مجبور ہو کر آسودہ خواب جسم پر نظر ڈالی جو اپنی مختصر جمیل عمر میں شاید کبھی اِس طرح بے ترتیبی اور تکلیف کے ساتھ ایسے بھیانک ماحول میں یوں فرشِ خاک پر دراز نہ ہوا ہوگا۔ جس پر کبھی ایسی بپتا نہ پڑی ہوگی۔

ڈیڑھ بجا ہوگا۔ آگ مر چکی تھی۔ اور کوٹھری کی نیم گرم فضا پر برودت غالب آچکی تھی۔ غریب کوٹ کہاں تک میری مدافعت کر سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میرے سرد جسم کی سردی سے وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ دفعتاً مجھے اپنے گھوڑے کا خیال آیا۔ معلوم نہیں وہ غریب کتنا بھیگا ہوگا۔ میں فوراً باہر نکل کر گیا۔ الامان! کس بلا کی سردی تھی۔ جب واپس آیا ہوں تو میرے

دانت زور زور سے کٹکٹا رہے تھے اور جسم سردی سے لرز رہا تھا۔ اُس وقت تو میں شیخت میں آکر سپاہی بن گیا۔ لیکن اتنا نہ سوچا کہ آخر ہوں تو بیسویں صدی کی پیدائش۔ یہ پُرانے زمانے کا جسم تو تھا نہیں جو اِس مصیبت کی تاب لا سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پسلی اور سینے میں درد شروع ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد تو سینے کے درد کی یہ کیفیت تھی کہ سانس نہیں لی جا رہی تھی۔ دفعتاً باہر نکل جانے سے سردی نے ایک دم اپنا خطرناک حملہ کر دیا اور مجھے نمونیا ہو گیا۔

جب میری حالت غیر ہونے لگی تو میں نے رضا کو آواز دی۔ مگر وہ ایسا سو رہا تھا گویا اپنے مکان میں آرام سے محوِ خواب ہے۔ مشکل یہ تھی کہ میری آواز کپکپی کی وجہ سے اچھی طرح نکلتی نہ تھی۔ بدقت میں نے پھر اپنی کپکپاتی آواز نکالی جس سے ہمشیرۂ رضا ایک دم بیدار ہو کر اُٹھ بیٹھی پہلے چند لمحوں تک اِس غریب کو مطلق خیال نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ اِس لئے وہ نہایت بے احتیاطی سے اٹھی مجھے ہوش کب تھا کہ اِس بے احتیاطی کی قدر کر سکتا۔ میں نے شکستہ آواز میں اُس کو اپنی حالت سے آگاہ کیا تو وہ سخت پریشان ہوئی جلدی سے رضا کو جگایا۔ آگ کو بچی کھچی لکڑیوں سے پھر تیز کیا گیا۔ مجھے کمبل اوڑھایا گیا اور جب میری سردی اس سے بھی کم نہ ہوتی تو رضا نے اپنی جوان حرارت سے میرے جسم کو گرم کیا۔ پھر جو مجھے تیز بخار چڑھا ہے۔ خدا کی پناہ۔ کس بلا کا کرب، کیسی بے چینی، بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ بڑی بے موقع آئی موت میں نے دِل میں کہا۔

کون غسل دے گا۔ کون نماز جنازہ پڑھیگا۔ مگر وہ ہستی میرے پاس موجود تھی جس کے سامنے مرنا حاصل حیات تھا۔

خدا خدا کر کے میں نے صبح پکڑی۔ سویرا ہوتے ہی رضا میرا گھوڑا لیکر شہر کی طرف دوڑا۔ دن میں اور آگ کا انتظام کیا گیا اور سینک بھی پہنچایا گیا۔ مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ حالت بگڑتی گئی۔ یہ ناتجربہ کار بے بس خاتون میرے سرہانے تھی جو میری کرب اور بے چینی دیکھکر مایوسی کے آنسو بہا رہی تھی۔ اس جنگل میں اور کیا تدبیر عمل میں آ سکتی تھی۔ ہر طرف سے مداوا کے ابواب بند تھے۔

شکر ہے بحران طاری نہ ہوا تھا۔ مجھے ہوش تھا۔ تکلیف ضبط کرتے کرتے کلیجہ شق ہوا جا رہا تھا۔ آخر چیخ منہ سے نکلنی شروع ہو گئی۔ دفعتاً میں نے سُنا کیا آپ کو بہت تکلیف ہے؟ خدایا ان پر رحم کر۔" مجھے پھر خیال آیا کہ یہ بیکس لڑکی میری چیخ پکار سے اور گھبرا جائے گی۔ پھر ضبط کرنا شروع کیا۔

"خاتون ذرا یٰسین شریف تو پڑھو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں مرونگا نہیں کم از کم اُس وقت تک نہیں مرونگا جب تک تم یہاں ہو۔ ہاں اچھی ذرا سنا تو یٰسین" میں نے شکستہ آواز میں کہا۔

یٰسین کو حصول برکت کے بجائے موت کی گھڑی آسان کرنے کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ خاتون کو بھی یہی مغالطہ ہوا کہ میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے اور رونا شروع کیا۔ جب تلاوت کی آواز نہیں تو میں نے

کمبل میں سے مُنہ نِکال کر پھر اپنی درخواست کو دُہرایا۔ مگر وہاں تو ہچکیاں لگ رہی تھیں۔

"تم پریشان نہ ہو۔ میں مَر نہیں رہا ہوں۔ ہاں شاباش ذرا کرو شروع" میں نے اُس کو تسکین دیتے ہوئے کہا۔ چند منٹ تک خاموش رہی اِس کے بعد ناہموار آواز میں آیتِ پاک شروع کی۔ سبحان اللہ وہی شیرین آواز تھی وہی قراءت تھی اور وہی صحتِ الفاظ۔ اس کو سننے میں میں ایسا گم ہوا کہ برائے چندے اپنی تکلیف بھول گیا۔

بارہ بجے ہونگے کہ رضا ایمبولینس کار لے کر آپہنچا۔ مجھے اُس میں ڈالدیا گیا۔ رضا اور اُس کی بہن بھی اس میں بیٹھ گئی۔ میں نے راہ میں رضا سے کہدیا کہ اس تمام حادثہ کی خبر سپرنٹنڈنٹ صاحب کو نہیں ہونی چاہیئے۔ صرف اُن سے اِتنا کہدیا جائے کہ کار خراب ہو جانے سے تم لوگ ایک گاؤں میں شب باش ہو گئے تھے۔ مرنے کی خبر اے جانِ جگر مل جائے دکھ

شہر آنے پر وہ لوگ اُتر کر تانگے میں گھر روانہ ہو گئے اور میں شفاخانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رضا پھر میرے پاس آگیا۔ کئی روز تک میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے اچھا ہوا۔ اِس دوران میں کئی بار رضا کی ہمشیرہ نے میری کیفیت دریافت کرائی۔ اور ممکن ہے یہ بالواسطہ مزاج پُرسی ہی میرے لئے پیامِ شفا ثابت ہوئی ہو۔

صحت یاب ہو جانے کے بعد میں ایک روز سپرنٹنڈنٹ صاحب کے وہاں گیا وہ میرے حلیہ کو دیکھکر حیران رہ گئے۔ برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔

مجروح کار بھی صحت یاب ہو چکی تھی اُس کو دیکھکر وہ طوفانی رات مع اپنے تمام مہیب و دلکش واقعات کے میری نظروں کے سامنے آگئی۔ رضیہ کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں آیا ہوں۔ اُس نے بھی پیانو کے نغموں سے میری سمع نوازی کی۔

افسوس ہمارا رومان بڑا گنگ قسم کا رہا۔ کیونکہ رضیہ ایک خالص اسلامی معاشرت کی پلی ہوئی لڑکی تھی۔ نہ اُس نے اپنے ننھے سے دل کا بھید کبھی مجھے دیا نہ علانیہ میرے اسرار محبت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ سب کچھ باوجود اس قدر پس پردہ منظر ہونے کے کس قدر دلفریب رومان تھا۔ مجھے نا معلوم کیوں یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ناپسند نہیں کرتی ہے۔ اور میرا دل نا معلوم کیوں باوجود اس دور باشی کے اس کو پیار کرنے لگا تھا۔

میں نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے اِس واقعہ کا ذکر اُس وقت تک نہیں کیا جب تک میں اُن کی فرزندی میں نہ آگیا۔ جب اِن کو اس کا علم ہوا تو اُس وقت بھی وہ برافروختہ ہوئے بغیر نہ رہے۔ اُس وقت رضیہ کا شرم سے پانی پانی ہونا۔ رضا کا بغلیں جھانکنا اور میرا دل ہی دل میں خوش ہونا دیکھنے کے قابل منظر تھا۔

کیا اچھا ہوتا اگر دنیا میں سب مسلمان لڑکیاں
رضیہ جیسی شرم دار ہوتیں —

This Novel has many stories, but interesting are these.

دِل جس کو پیار کرے!

"RASHID"

یاد اُس کی رُلا دیتی ہے
جس نے مجھے بھلا دیا

دیا

سنو بھیو سنو بہنو
سن لو میری بات
[illegible] مردوں کی داستان

(۴۰)

JAK

کیوں اُن کو بھلائیں ہم
جب خود کو بھلانا ہے

SAK

دیدار

یاد میں تیری جہاں کو بھولتا جاتا ہوں میں
بھولنے والے کبھی تجھکو بھی یاد آتا ہوں میں

چار سال سے وہ مجھے چاہے جا رہی تھی اور مجھکو مطلق اس کا احساس نہ تھا۔ یہ کہنے میں تو شاید میں غلطی کر رہا ہوں کہ مجھکو احساس نہ تھا۔ میں اکثر دیکھتا تھا کہ اس کی با حیا حسین آنکھیں میرا دور تک تعاقب کیا کرتی تھیں۔ تعطیلات میں وہ میری آمد کی بے چینی سے منتظر رہا کرتی تھی اور جب میں اس کے مکان پر پہونچتا تو مسرت و شرم کی درمیانی حالت میں مجھ سے کہتی "میرا خیال تھا کہ تم چھٹیوں میں لکھنو چلے جاؤ گے۔ اچھا ہوا یہاں آ گئے۔ میں روز" اس کے بعد مسرت پر حیا غالب آ جاتی اور وہ چپ ہو جاتی۔ ان باتوں سے مجھے دھندلا سا خیال ہو گیا تھا کہ وہ میری بے کیف ہستی میں دلچسپی لیتی ہے مگر محض دلچسپی۔

آہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی تمہیں چاہے اور تم کو خبر نہ ہو باوجود اس قدر رکھ رکھاؤ کے وہ میرے عشق فہم دل سے اپنے جذبات محبت کی پردہ داری نہ کر سکی۔ ایک روز میں بالاخانہ پر سو رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے صبح

اُس سے اپنے رومال دھولے کی درخواست کی تھی جن کو سکھانے کے لیے اس وقت وہ اُوپر آئی تھی۔ مجھ پر نیم غنودگی سی طاری تھی اور اسی حالت میں میرا بایاں ہاتھ بُری طرح پلنگ پر سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس کی نظر پڑی ہوگی۔ آہستہ سے اُس کو سنبھالا اور میرے سینے پر رکھدیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ وہ اَب تک میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔ "آپ کے رومال صاف کردیئے گئے ہیں۔"

"بڑا کرم فرمایا۔" میں نے مزید شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ نیچے کسی کے پیر کی چاپ ہوتی اور وہ بجلی کی طرح دوسری راہ سے اُتر کر غائب ہوگئی۔

اس کے بعد تقریباً چھ ماہ تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے کس قدر آسانی سے چھ ماہ کہدیا ہے۔ یہ طویل مدت مجھے چھ صدی کے برابر معلوم ہوئی۔ میں روز اس کو دل میں یاد کیا کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر اُس کے پاس پہونچ جاؤں۔

(افسوس محبت اپنے نزول کا وقت ومحل دیکھنے کی عادی نہیں ہے)

یہ وہ زمانہ تھا جب میں اپنی بیوی کی مسلسل علالت (جو اَب سخت خطرناک صورت اختیار کرچکی تھی) کے باعث سخت پریشان وغیر مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ بیوی کی بیماری کا تقاضہ تھا کہ اُس کے لیے جلد از جلد اچھی سے اچھی طبی امداد بہم پہونچائی جائے۔ بہتر سے بہتر مقام پر اس کو رکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ وقت اُس کے پاس صرف کیا جائے۔

میں کبھی اپنے متعلقین کے باب میں بے پرواہ اور کم اِلتفات نہیں رہا ہوں۔ میں ہر عزیز سے بہ خیال قرابت داری یا علائقِ خون، تعلقات نبھائے رہنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ اِنسانی فرض سمجھکر اُن سے رَوابط قائم رکھتا ہوں اور اِس فرض شناسی ہی سے ہمیشہ نقصان اُٹھاتا رہتا ہوں قطع نظر بیوی کی محبوبیت کے، میں نے بہ پاسِ فرض اس کے علاج میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، لیکن وہ صحت یاب ہونے میں، یا قدرت اُس کو صحت یاب کرنے میں خدا جانے میری جانب سے کون سے گرانقدر اِنسانی جذبے کی قربانی کی منتظر تھی کہ اُس کی صحت یابی کے کوئی آثار ہی نظر نہیں آتے تھے! میں نے اپنی جسمانی آسائش، اپنے مطالعہ کی راحت اور دوستوں کی سوسائٹی کی مسرت سب کچھ بیوی کی تندرستی کی باز حصول کے نذر کر دی تھی۔ لیکن وہ خلش بے زبان، وہ پُر اَثر تڑپ، وہ جذبات کا تلاطم ہیجان جو روزِ موت کی طرح میرا گلا گھوٹتا رہتا تھا اسی قدر وزن وعرض کے ساتھ برقرار تھا۔ عریض سُنئے میں آپ شاید وزن تسلیم نہیں کریں گے لیکن اِس عجیب دار وگیر میں گناہوں سے زیادہ وزن تھا، خباثت سے زیادہ صلابت تھی۔ اور موت سے زیادہ پابندی تھی۔ محبت کی جمیل نازنین کی تعریف میں میں نے "گناہ" اور "خباثت" وغیرہ جیسے نامبارک وغیرشعری الفاظ اِستعمال کئے ہیں۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ محبت کے بے محل دراندازی کا اِنتقام آخر مجھے کسی طرح تو لینے دیجئے!۔

اچھا تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ میں نے اپنی خارجی وجسمانی دلچسپیاں یک قلم بیوی کی تیمار داری کی خاطر ترک کر دی تھیں۔ لیکن اپنے نئے سودے پر مسلسل ضرب لگا کر بھی میں اس کو اس قابل نہ کر سکا کہ بقدرِ یک ذرّہ وہ میری بیوی کی تندرستی کی کوششوں میں صرف ہو سکتا! فرض و وجدان میں ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ ہائے میری پوزیشن بھی کس قدر نازک ہو گئی تھی۔ پہلے بیوی کا علاج کرتا یا اپنی بیماریٔ دل کا علاج! ادھر دنیا والوں کا خوف، اعزا و اقربا کے طعنوں کا ڈر پھر خود اپنا فرض شوہرانہ، ہمدردی انسانی وللّٰہیت اور اُدھر تنہا محبت، واحد محبت کی پری کی طرح پُرطنز مُسکراہٹ!۔ اللہ۔ اس کارزارِ حیات، اس زندگی کے خونین میدان اُس جیون کی مستقل جنگ کو کس اصلاح سے فتح کیا جا سکتا ہے!

”میں اپنے سرمایہ کی آخری پائی تک تمہارا علاج کراؤں گا میں زندگی کے آخری سانس تک تمہاری تیمار داری میں صرف کر دونگا“ میں بیوی سے کہتا۔ دفعتاً دل کو ایک جھٹکا سا لگتا اور سینے کے اندر سے ایک پر تحقیر و طنز آمیز قہقہہ کی آواز آتی۔ میں چونک اُٹھتا اور دیوانوں کی طرح اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگتا۔ میں حکیم یا ڈاکٹر سے اپنی بیوی کو تندرست کر دینے کی منت کرتا لیکن ایکا ایکی چُپ ہو جاتا۔ میرے منہ پر ایک طمانچہ سا لگتا اور کوئی باطنی قوت کان پکڑ کر کہتی ”

کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟

کیا تیری اپیل میں صداقت ہے؟

کیا تیری تمام حرکات غیر منافقانہ ہیں؟" میں اپنے تمام حواس جمع کر کے جواب دیتا ہوں "ہاں جو کچھ کر رہا ہوں سچے دل سے کر رہا ہوں۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں صداقت تاب زبان سے کہہ رہا ہوں" پھر دل کی گہرائیوں میں سے ایک طویل، مسلسل اور بلند قہقہہ بلند ہوتا جس کی غلیظ تحقیر، بکروہ تضحیک اور گندے استہزا سے میں کئی منٹ تک جہنمی صعوبت میں مبتلا رہتا۔

اِن دو متضاد قسم کی کشمکش نے میری عجیب حالت کر دی تھیں۔ آنکھیں بیوی کی طرف تھیں تو آنکھوں کا نور کسی اور جگہ، حواس یہاں تھے تو حیات کسی اور جگہ، دماغ یہاں تھا تو دل کسی اور جگہ۔ ایک دن میں نے سوچا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے بیوی کو الہ آباد لے جاؤں۔ اس کی آب و ہوا بدل جائیگی اور میں بھی اپنی شمسہ کو دیکھ لونگا۔ اَب یہ نہ پُوچھئے کہ اِن دونوں چیزوں میں سے میرے لئے مقدم کیا چیز تھی۔ خیر تو الہ آباد پہونچا۔

"اَب آپ کے گھر میں کیا حال ہے؟" شمسہ نے مجھ سے پُوچھا۔

"بدستور حالت ہے۔ شمسہ مجھے کل ایک نئے امر کا اِنکشاف ہوا ہے" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ عید کے چاند میں" شمسہ نے شرما کر سر جھکا لیا۔

"بتاؤ نہ شرماتی کیوں ہو؟" مجھے جب سے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسکی شادی ہونے والی ہے عجیب حالت تھی۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ اَب دِل

بیٹھا - اَب دل بیٹھا - اس سے یہ سوال کرنے میں میں اندوہ کے شائبہ کو نہ چھپا سکا تھا - میرے لَب تھر تھرا رہے تھے - وہ اَب بھی چپ رہی - جب میں نے قسم دلائی تو دھیمے سے بولی :" آخر اس قدر اصرار سے کیوں پوچھ رہے ہیں آپ - بالکل پیچھے ہی پڑ گئے " اِس کے بعد نظر اُٹھا کر میری جانب دیکھا - میری حالت متغیر تھی -

" ویسے ہی پوچھ رہا ہوں " میں نے اُس کی پیاری نظروں کی زَد سے ہٹ کر کہا -

" شاید " اُس نے آہستہ سے جواب دیا - اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک گہرے سانس کو غیر مستقل طریقے سے خارج کیا گیا ہے -

" میری دِلی مبارکباد قبول کرو شمہ - اللہ تمہیں خوش رکھے ——— "

" مگر یہ مجھے دُعائیں دینے میں آپ مُنہ کیوں بسورتے جارہے ہیں؟" اُس نے پھر شوخی سے میری جانب دیکھکر کہا - میں نے بہت جلد اپنی حالت کو سنبھالا اور بُولا :" سچے دِل سے جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ رَد کر ہی مانگی جاتی ہیں "

" تو آپ میرے لئے اِس باب میں سچے دل سے دُعا کرتے ہیں؟" اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر دریافت کیا -

" ہاں " میں نے دبی زبان سے کہا -

" اچھا یوں کہیئے کہ میں واللہ سچے دِل سے دُعا کرتا ہوں کہ تمہاری

شادی ہو جائے "

"نہیں "

"کیوں نہیں ؟ "

"نہیں - میں نہیں چاہتا کہ تمہاری شادی ہو جائے "

"کیوں نہیں ؟ "

"میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے جُدا ہو جاؤ ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لی جاؤ "

آخر کیوں نہیں چاہتے ؟ "

"بعض اُمور ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی علت نہیں ہوتی "

"مہمل " اُس نے ہنسکر کہا -

"نہیں با معنی - آفتاب سے زیادہ روشن - وجودِ باری کی طرح واضح - میں تم سے محبت کرتا ہوں شمسہ ، میں تمہیں پوجتا ہوں میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی تم کو مجھ سے چھین کرلے جائے "

"اور چار سال سے کہاں تھے ؟ "

" میں چار سال سے جہنم میں تھا لیکن گزشتہ چھ ماہ سے تمہاری محبت نے مجھے بہشت میں پہونچا دیا "

"تو میں بھی چار سال چھ ماہ سے جہنم میں تھی اور آج تمہارے ساتھ ہی بہشت میں داخل ہوئی ہوں "

"شمسہ کیا تم کو بھی مجھ سے محبت ہے ؟ " میں نے وحشیانہ

دریافت کیا۔

"ہاں۔ خدا کے لئے جامہ انسانیت میں ہی رہو۔ میں چار سال سے تمہارے خیال ——— لیکن زاہد تم تو مجھ سے چھپتے ہوئے ہو"

"میری روح۔ محبت پرست دلوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مادی طور پر متحد کئے جائیں۔ ہماری محبت آسمانی ہے؟"

"آسمانی محبت آپ آسمان پر آباد کیجئے۔ ہم کو حقائق نظر انداز نہیں کر دینے چاہئیں زاہد۔"

"ہماری پامال مایوسی محبت میں ایک امید کی شعاع بھی ہے شمسہ۔ میری بیوی بیمار ———"

میری زبان رک گئی۔ اب اندرون سینہ سے قہقہہ کی نہیں آرہی تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی قوت تحسین و مرحبا پکار رہی ہے۔ آہ خطرناک قوت!

"زاہد! یہ تخیل؟"

"شمسہ مجھے معاف کردو۔ آہ لیکن ———" میں جز بز ہو کر رہ گیا کیسا خوشگوار تخیل تھا لیکن کتنا بھیانک بھی۔

شمسہ تم میری ہو ——— میری ———"

"مگر ایک عزیز زندگی کی قیمت پر۔ اُف قدرت کی ستم ظریفی۔"

"نہیں بہرصورت تم میری ہو۔ اچھا اپنی پیاری زبان سے بھی کہدو کہ تم میری ہو۔"

"ہاں شاعرانہ زبان میں تمہاری ہوں۔ لیکن ہم میں بہت بُعد ہے زاہد!
مجھے تعجب ہے کہ تم مجھ سے کس طرح محبت کر بیٹھے۔ میرا تم سے محبت کرنا بجا تھا۔
کیونکہ میں ابھی آزاد ہوں۔ لیکن تم "برائے دیگراں" ہوتے ہوئے بھی میری
محبت میں کیوں پھنس گئے"

"سبحان اللہ! گویا تمہارے خیال میں آزاد و پابند کی تخصیص
محبت کیا کرتی ہے۔ نہیں میری جان۔ دل جس کو پیار کرے"

شمسہ خاموش ہوگئی۔

"شمسہ" میں نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا "آؤ اب ہم ذرا وضاحت
سے بات چیت کریں۔ اگر قضا و قدر ہمارے "موانعات" کو ہماری راہ
میں سے ہٹا دینے کا کرم کرے"

میں خود بخود چُپ سا ہوگیا۔ بیمار کا
مسترحم و ملول چہرہ میری آنکھوں کے آگے آگیا اور اس کی زبان سے کبھی یہ
نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں کے گوشے گوشے میں گونجنے لگے "تم میرے
علاج میں کس قدر انہماک سے کام لے رہے ہو زاہد۔ تم مجھے نہیں مرنے
دو گے۔ مجھے اُمید ہے نہیں مرنے دو گے"

دفعتاً میرے منہ سے ایک وحشت کی چیخ نکل گئی۔ میں کپکپا اٹھا۔
بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالا اور بے اختیار شمسہ کے سامنے سے اُٹھ کر
بھاگا۔ بیوی کے پاس پہونچا تو اس کی آج حالت خراب پائی۔ مجھے دیکھ کر
ایک تبسم افسردہ اُس کے خشک لبوں پر آگیا۔ اُس نے اپنے لاغر ہاتھ
سے میرا ہاتھ تھاما۔ اور بولی "جب تم میرے پاس آجاتے ہو تو میری

بیماری آدھی جاتی رہتی ہے۔ بیٹھے رہو۔ میرے ہی پاس بیٹھے رہو۔ اب کہیں نجانا۔"

"نہیں کہیں نہیں جاؤنگا۔ گھبراؤ نہیں میں یہیں بیٹھا رہونگا۔" یہہ کہتے ہوئے مجھے پہلی بار ایسا محسوس ہوا گویا میں نے کوئی زبردست کام کیا ہے۔

شمسہ تندرست، جوان، حسین، شوخ و ذہین اور محبت پرست رضیہ بیمار، موت کے چنگل میں گرفتار، لاغر، کمزور، صحت باختہ۔ اور اور میری راہ میں، ہر راہ میں سنگِ گراں۔ شادی سے قبل میں اُس کو نہیں جانتا تھا نہ وہ مجھے جانتی تھی۔ لیکن شادی کے بعد سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو مدت سے جانتے تھے۔ وہ مجھے کس قدر چاہتی تھی اور میں بھی اس کی محبت کی کس قدر قدر و اعتراف کرتا تھا۔ آہ لیکن وہ بیوی تھی یعنی اس حقیقتِ مسلمہ کی شکار رہتی جس کو اثرات یکجائی ایک بالکل معمولی ہستی بنا دیا کرتے ہیں۔ لیکن میں اس کا شوہر تھا۔ فرض شناس شوہر۔ میں اُس کو آسانی سے نہیں مرنے دے سکتا تھا۔ نہیں کسی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا تھا؛ شمسہ کی محبت کی قیمت پر بھی نہیں مرنے دے سکتا! شمسہ کی دراندازی بڑی ہی بے محل تھی۔ میں نے اس کو کیوں چاہنا شروع کر دیا۔ میری تمام توجہ کی مستحق میری بیوی تھی۔ وہی رہے گی۔ شمسہ کی کل شادی ہو جائے گی۔ وہ دوسرے کی امانت ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو یہ اُس کی غلطی ہے جس کا ازالہ بہت جلد ہو جائیگا۔ ہاں اُس وقت یقینی ہو جائیگا۔

وہ دوسرے کے آغوش میں پہونچ جائیگی۔

میں رضیہ کے سرہانے آرام کرسی پر اسی خیال میں دراز ہو گیا اور نہ معلوم کب نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو تین باتوں کا مجھے سب سے پہلے احساس ہوا میری گردن انسانی بازوؤں سے کسی ہوئی تھی۔ میں کرسی میں بالکل بھنچا ہوا پڑا تھا اور میرے قریب کسی سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ میں نے گھبرا کر سر اُٹھا کر اوپر دیکھا اور شمسہ کو اپنے قریب پا کر دیوانوں کی طرح اس کی طرف نظریں جما دیں پھر فوراً ہی کسی خیال سے پریشان ہو کر رضیہ کے پلنگ کی طرف دیکھا جو اب خالی پڑا ہوا تھا۔

"رضیہ کہاں گئی؟" میں نے اپنی حالت سنبھالکر اور شمسہ کے نازک بازوؤں سے اپنی گردن آزاد کر کے دریافت کیا۔

"حکیم جی کے ہاں"

"اور تم یہاں کب نازل ہوئیں؟"

"ہاں میں بلا ہوں کہ نازل ہوئی۔ کیوں؟ زاہد اِس میں تمہارا قصور نہیں ہے میرا ہی ہے۔ میں اندھی تھی کہ تم کو چاہ بیٹھی حالانکہ تم ایک محبت پرست بیوی کے شوہر ہو۔ میں تم سے معافی چاہتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ آپ کی بیوی کے اور آپ کے مابین حائل نہیں ہونگی"

ہائے اُس وقت مجھ پر کس قدر نفسیاتی دباؤ پڑا۔ اگر شمسہ یہاں آکر اس وقت اپنی محبت بگھارتی تو میں اپنے اگلے تہیہ کی بنا پر ضرور اُس کو

مایوس کرنے میں کامیاب ہوجاتا۔ لیکن وہ ظالم تو خود کھنچنے لگی۔ آہ عورت جب محبت قبول محبت کرکے مرد سے کھنچنے لگتی ہے تو مرد کی روح جسم سے کھنچنے لگتی ہے۔ اُس وقت تمام مردانہ خودداری۔ عہد پندار وغیرہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اِس نفسیاتی مسئلہ کی بنا پر شمسہ نے بھی مجھے پھر جیت لیا۔ میں اپنے تمام پچھلے فیصلے کو فراموش کر کے دیوانہ وار کھڑا ہو گیا اور اس کو اپنے بازوؤں میں جمع کر کے بولا۔" میری رُوح ایک ذرا سے مذاق کا اتنا بُرا مان گئیں شمسہ محبت تو جس کے حصّے کی ہوتی ہے اُسی کو ملکر رہتی ہے۔ اس میں بیوی وغیرہ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ تو میری ہے اور میں تیرا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تیرا ہوں شمسہ"

جب بیوی کو یہاں بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں واپس اُس کو اپنے وطن لے آیا۔ جنگ عظیم کو آپ کیا اہمیت دیتے ہیں۔ میرے مختصر سینے میں آج کل صدہا جنگ عظیم کے خونین حشر موجود تھے۔ قوتِ فیصلہ بالکل مرچکی تھی۔ پاسِ فرض شمسہ کی شانِ محبت کے چرکے کھاتے کھاتے میری آنکھوں کے سامنے پڑا تڑپ رہا تھا۔ اِنسانیت وہمدردی مجروح ہوکر کونے میں منہ دئے رو رہی تھیں۔ بس دنیا کے نظام کو تہ وبالا کر دینے والی شئے جس کو محبت کہتے ہیں۔ اپنے قوی ہاتھ میں فتحمندی کا نشان لئے سکندرانہ شان سے کھڑی نظر آرہی تھی۔ میری حالت بڑی ہی قابلِ رحم تھی۔ اس قدر قابلِ رحم کہ مجھ کو خود کو اپنی حالتِ زار پر ترس آنے لگتا تھا۔ یہ اِنسان کی انتہائی بے کسی کا عالم ہوتا ہے کہ اُس کو خود اپنے پر رحم آنے لگے۔ بقول امیر ؎

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں آسیر
اپنی حالت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

عید کا مہینہ بھی آگیا لیکن مع پیام محرم کے۔ ایک روز شمسہ کے والد کا خط آیا۔ ایک بڑا سا لفافہ تھا۔ کھولتا ہوں تو اُس کے اندر ایک چھپا ہوا کارڈ نکلا۔ وہی پرانے زمانے کی اردو۔ شمسہ کی شادی طے ہو چکی تھی اور یہ اسی کا دعوت نامہ تھا۔ خوب! آخر اس کی شادی قرار پا ہی گئی۔ اس شادی میں مجھے شریک ہونے کی کیوں دعوت دی جا رہی ہے۔ میری تو بیوی بیمار ہے دل بیمار ہے۔ شمسہ کیا کہتی ہے۔ کیا وہ بھی چاہتی ہے کہ میں اپنی قبر اپنی آنکھوں سے بنتی ہوئی دیکھوں؟۔ یہ لوگ مجھے شادی میں شریک کر کے متوقع ہیں کہ میں اپنی تمناؤں کی پالی پر دل کھول کر مسرور ہوں؟ اُن کے فریب مسرت میں برابر کی شرکت کروں؟ معاذ اللہ۔

اگر اس شادی کو ہونا تھا تو اُس کو میرے علم میں آلے کی کیا ضرورت تھی۔ چپ چاپ کیوں نہیں ہو گئی۔ ہم پر جو مصیبتیں نازل کی جاتی ہیں کیا اُن کا قدرت کی جانب سے ہم کو کوئی نوٹس دیا جاتا ہے؟ پھر اس اُم المصائب شادی کے باب میں مجھ پر یہ کرم کیوں کیا گیا؟ کیا یہ بات تیری شانِ کریمی کے شایان تھی؟ اُف خدا۔

شمسہ کی شادی ہو گئی۔ میں کس دل سے اس میں شریک ہوتا لیکن جانا پڑا۔ قدرت کا عتاب صرف اُسی پر ختم نہیں ہو گیا تھا کہ میں اس اپنی غارت گرِ تمنا شادی میں شریک ہوا۔ بلکہ میں نے اپنی منحوس آنکھوں سے

اُس کو دُلہن بنتے دیکھا۔ میں نے اپنے دیدۂ خونبار سے اس کو رخصت ہوتے ہوئے دیکھا اور میرے علم میں اس کی سہاگ کی رات کو لایا گیا۔ یہ ہیں جناب محبت کے انعامات۔

کہتے ہیں اور ہم بھی مدت سے سُن رہے ہیں کہ اس خراب آبادِ گیتی کا نظام نہایت ہی معقول طریقے پہ قائم ہے۔ اِس لغو خیال پر میں تمام دُنیا کو ایک قہقہہ حقارت بلند کرنیکی دعوت دیتا ہوں۔ نظامِ عالم کے یہ معنی ہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کا سازگار رہے وہ ہماری زندگی سے مساعدت کرے۔ اگر پراگندیوں کے باوجود بھی آپ اس پوچ نظامِ عالم کے مداح ہیں تو ایک گول روزن میں چورس کیل ٹھونکنے کی کیوں نہیں تعریف کرتے؟ اس شادی کے پندرہ ہی یوم بعد میری بیوی کا اِنتقال ہوگیا جی ہاں اِنتقال ہوگیا — تاکہ میں سمجھ سکوں کہ میں منزل پر اس وقت پہونچا ہوں جب نشانِ منزل ہی نہ رہا جسرتیں اُس وقت پوری ہونگی جب سینہ مدفنِ حسرت بن جائیگا۔ میں کہتا ہوں اگر بیوی کو مارنا ہی تھا۔ اگر یہ ہونا ہی تھا تو اُس وقت کیوں نہوا جب اُس کو ہونا چاہیئے تھا۔ یہ پندرہ بیس روز پہلے کیوں نہ ہوا؟؟

میں نے بھی میدانِ زندگی کے بہت سے ہزیمت خوردہ برخود غلط صوفیوں کی طرح تصوف کے دامن میں پناہ لینی چاہی۔ نماز۔ ذکر۔ تلاوت کو شعارِ حیات بنالیا۔ زندگی کی لذتوں کو تج دیا۔ لیکن میں یقین کیساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا حقیقی مسجود کون ہے اگر اسکو بھی عبادت و ریاضت شمار کیا جا سکتا ہے کہ انسان اِسلامی ارکان کے ساتھ کامل بت پرستی کرے تو میں آج کل ایک زبردست مرتاض ہوں۔

This is a very good novel.

جب بنیاد کمزور ہو

بیرون نشست از

رحم کی طرح بزدل، مروت کی مانند کمزور اور مصیبت کے آنسوؤں کی طرح راستباز تھے مولوی صاحب۔

کہنے کو تو گریجویٹ تھے مگر شروع ہی سے الہیات کی بھاری سل کے نیچے دبے رہنے سے ان کا چال چلن بہت ہی زیادہ محتاط "ہمہ گریز" قسم کا ہو گیا تھا۔ سگریٹ؟ توبہ، خوش فعلیاں؟ استغفراللہ، نظربازی؟ معاذ اللہ۔ عورت؟ اجی اللہ اللہ!

چھ فٹ کے قد، پچیس سال کی عمر اور مُنّی سی ڈاڑھی کے درمیان صرف ایک عمر کے کچے پاسبانوں سے خوف تھا کہ وہ دھوکا کھا جائیں تو کھا جائیں ورنہ ویسے ہر پستی سے مقابلہ کرنے کو اُن کے پاس بلند قد تھا اور اشرار جہاں کے خلاف مُنّی سی پاکیزہ ڈاڑھی۔

جب وہ سلیم پور کی مختصر سی بستی کے مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو کر آئے تو اُن کی خودرو جمیل ڈاڑھی بھی ساتھ تھی اور بن بلائی جوانی بھی، سلیم پور میں بہت کم ایسے گھر تھے جو ان دونوں چیزوں کو پناہ دینے کے لئے آمادہ ہو رہے تھے۔ آخر بمشکل مجید شحنہ نے اُن کے لئے اپنے ہاں

جگہ نکالی اور مولانا جمیل اُس کے گھر میں جا جمے۔

دسمبر کی تجرد آزار راتیں تھیں، اور جمیل کی محتاط سنسان جوانی ایک چھوٹی سی ہوادار کوٹھڑی میں جمیل ابھی اپنے مُصلّے کے لئے جگہ تلاش ہی کر رہا تھا کہ مجید کی بیوی لالٹین لے کر دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔

" ابھی تو بیٹے تم اس لالٹین سے کام چلاؤ۔ دو ایک دن میں تم اپنا انتظام کر لینا۔"

" شکریہ۔ لالٹین تو میں اپنے ہمراہ لایا ہوں۔ ہاں تیل کی ضرورت ہوگی۔ اگر ـــــــ اگر ـــــــ "

" اِس لالٹین کا تیل اس میں لوٹ لو۔ کل بوتل منگوا دوں گی۔ کچھ کھاؤ گے؟"

" میرے پاس ستّو ہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجئے۔"

" واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے میں ابھی رشیدہ سے تمہارے لئے روٹی ڈلواتی ہوں۔ میاں ہم غریب آدمی ہیں۔ مگر ہاں اللہ کا دیا سب کچھ ہے بستر بچھا لو نا تم اُس چارپائی پر۔ ڈرو نہیں ہمارے ہاں کھٹمل نہیں ہیں۔ اچھا میں ابھی کھانا بھیجتی ہوں۔"

جمیل طاقوں کو صاف کرنے میں مصروف ہو گیا اور چوہوں کے بل میں اُس نے باہر سے لاکر اینٹیں ٹھونک دیں۔ بہت ہی قلیل عرصے میں یہ ویران کوٹھڑی ایک خوش سلیقہ پڑھے لکھے نوجوان کے کمرے کے مانند نظر آنے لگی۔

دُور ایک بار جمیل کو ایسا محسوس ہوا گویا اُس کی یہ تمام کارروائیاں کوئی پُچکلے پُچکلے دیکھ کر بھاگ جاتا ہے کبھی اُس نے روشن کمرے کے باہر والے تاریک دالان میں دوپٹہ اور شلوار کو اِدھر اُدھر متحرک دیکھا اور کبھی پاس والے دوسرے دالان میں کمرے کے انعکاس سے اس نے کسی کو کچھ چیز تلاش کرتے اور گنگناتے ہوئے محسوس کیا۔

"اجی قبلہ قبلہ اُس طرف نہیں ہے" دفعتاً ایک شوخ آواز اس کے کان میں آئی۔ اس کے بعد اس نے صاحب آواز کو خوان ہاتھ میں لئے دروازے میں کھڑا دیکھا۔ جوان اور خوبصورت۔ دشمن کی طرح بیباک نہیں۔ اِس بار مجید کی بیوی نہیں تھی۔

تعقوئی میں تھرتھری پیدا ہوئی اور رٹ گئی، جوانی جوانی کو سنبھالنے کے لئے بڑھی لیکن ہچکچا گئی "آپ کھانا لائی ہیں شاید" جمیل نے تین چھینکیں مسلسل رومال میں جذب کرکے پُوچھا۔

"جی۔ آپ نے اِس کمرے میں اَب کوئی جگہ ایسی باقی نہ چھوڑی جہاں اس بدقلعی خوان کو رکھکر اس کی زینت کو صدمہ پہونچنے سے بچایا جاسکے" رشیدہ نے کہا۔

"ہیں ہیں۔ یہ تو کو ——— مگر ایسا کیا ——— لائیے میں رکھدوں اس کو" جمیل صاحب نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔ اِس اثناء میں مجید کی بیوی بھی آگئی۔ جمیل کے حواس ٹھکانے آئے۔

کھانا کھانے کے بعد جمیل دراز ہوگیا مگر نزلہ نے اُس کو بڑا پریشان

کر رکھا تھا۔ بار بار چھینکے جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کی تمام ہستی ناک کی راہ سے بہہ جائے گی۔ گیارہ بج گئے۔ مگر نیند کا پتہ نہ تھا۔ ایک تو اجنبی جگہ میں اِنسان کو بے خوابی کی شکایت ہو جاتی ہے اور دوسرے رشیدہ جیسی لڑکی کی دراندازی کا خوف یا مسّرت ہو تو ویسے بھی جاگتے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ جمیل چھینکوں سے اپنی نیند اُڑا رہا تھا۔ کتاب اس کے ہاتھ میں تھی نظریں خواہ مخواہ دروازے پر ——— !

بارہ بجے ہونگے کہ پیروں کی چاپ ہوئی اور رشیدہ ایک سیاہ دوپٹہ اوڑھے ہوئے نمودار ہوئی۔ اُس کی شوخ آنکھوں میں مداخلت بیجا کی معذرت کے اثرات مُطلق نہیں پائے جا رہے تھے بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کو اپنی نوم شکن و ہوش ربا قوت کا پُورا علم تھا اور وہ اُس وقت اِس یقین کامل کے ساتھ آئی تھی کہ مولوی صاحب جاگ رہے ہونگے، اُن کو جاگتے رہنے پر مجبور کر دیا جا چکا ہے۔

"پانی تو نہیں پیجیے گا؟" اُس نے دھیمے لہجہ میں پُوچھا۔

"پی تو لیتا مگر ٹھنڈے پانی سے نزلہ اور تیز ہو جائیگا۔"

"تو چائے حاضر کر دوں؟"

"اس وقت؟ نہیں اَب تو سو جایئے۔ صبح دیکھا جائیگا آپ اب تک نہیں سوئیں؟"

"آپ کی چھینکیں سونے بھی دیں۔"

"مجھے بہت افسوس ہے۔ اچھا میں اَب اُن کو ضبط کرنے کی کوشش

کروں گا۔"

رشیدہ نے شوخی سے گردن ہلائی اور غائب ہو گئی۔

اس کے جاتے ہی مولوی صاحب کو ایسا معلوم ہوا گویا نہ صرف نزلہ کی تکلیف نے بلکہ اور بہت سی گرانیوں نے اُن کو آ دبوچا۔ اب وہ گویا ایک چلتے تختے پر کھڑے ہوئے کوشش کر رہے تھے کہ پیر جمے رہیں۔

تین بج گئے نیند بازی ہار چکی تھی۔ جمیل چھینکیں ضبط کر رہا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک زندہ جسم میں لگے ہوئے چاقو کے زخم میں سے خون کے فوّارے کو روک رہا ہے۔

"اُف کس بلا کا نزلہ ہوا ہے۔ آج میرے دماغ کی خیر نہیں" اُس نے سر کو پلنگ کی پٹی پر پٹک کر کہا۔ اس کا تمام چہرہ متورّم نظر آ رہا تھا۔ آنکھ اور ناک سے پانی رواں تھا۔ اور سر پھٹا جا رہا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" رشیدہ نے ساڑھے تین بجے رات کے پھر آ کر دریافت کیا۔

"آپ میری وجہ سے ناحق پریشان ہو رہی ہیں، نزلہ ہی تو ہے ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نزلہ تو بڑا ہی موذی مرض ہے۔ میرے ہمراہ آئیے میں آپ کو تیر بہدف دوا بتاتی ہوں۔"

"کہاں؟"

"کہاں کیا اس طرح دیوانوں کی طرح مجھے نہ دیکھئے۔ اگر فوراً

اچھا ہونا ہے تو جلد اُٹھئے۔

جمیل پہلے تو چکرایا پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ آخر آج رات کو رشیدہ پر کیا بیتا پڑی تھی کہ اب تک جاگ رہی تھی۔ بات یہ تھی کہ چور نے چور کو پہچان لیا تھا۔ یوں ایک طرف عورت حیا کی خود بخود اُٹھ جانے والی چادر اوڑھے کھڑی تھی اور مرد پاکبازی کے محرک پیرہن میں ملبوس تھا مگر آگ پر کسی قسم کا پردہ نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔

رشیدہ چپکے سے مکان کے باہر نکلی اور اُس کے پیچھے جمیل اس گاؤں میں آئے ہوئے تقوی کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گذر رہے تھے، ابھی تو زرع نے اپنے وزنی اُصولوں سے اس بستی میں مناہی کی خاک اور مٹی کو روکنے کا موقع بھی حاصل نہیں کیا تھا، ابھی جمیل طہارت کی فصیل کے نیچے فحش کی نالی کا اندازہ بھی نہ کرنے پایا تھا کہ اس پر غفلت میں گناہ نے شب خون مار دیا۔ جس طرح آسمان بغیر بادلوں کے مینہ نہیں برسا سکتا ہے اِسی طرح اِنسان بغیر کیریکٹر کے تقوی کو نہیں سنبھال سکتا۔ آسمان کو بارش کی خاطر مکدر ہونا پڑتا ہے، اِنسان کو بھی کردار سازی میں تحلیل ہونا پڑتا ہے۔ پاکبازی نہ تو جُبہ و دستاریں لپٹی ہوئی ہے اور نہ رند کے ساغر میں تہ نشین ہے۔ وہ وہیں ہے جہاں اُس کی جڑوں کو مضبوط ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔

جمیل حیران ایک تاریک گلی میں رشیدہ کے پیچھے چلا رہا تھا آخر ایک باغیچے کی دیوار کے پاس پہونچکر وہ رکی۔ چوطرف اندھیرا تھا اور

سنّاٹا۔ آہستہ سے وہ اندر داخل ہوئی اور ٹوودوں کو کچلتی ہوئی ایک بڑے سے کمرے کے پاس جاکر رُکی، دھیمے سے قفل کھولا اور مع مولوی صاحب کے اندر۔ اُس کے بعد اُس نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔

جمیل کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آلہٰی یہ کیا علاج ہے یہ کیسی دَوا ہے۔

"ذرا اس کو تھامئے" رشیدہ نے اندھیرے میں کوئی شے جمیل کی جانب بڑھا کر کہا۔ جمیل کا اندھا ہاتھ رشیدہ کے ہاتھ کو تو نہ دیکھ سکا ہاں اُس کی کمر سے مس ہوگیا۔

"یہ لیجئے" اُس نے جمیل کے ہاتھ میں موم بتی دیکر کہا اور خود دیا سلائی سے اس کو جلایا۔

اچھا خاصہ کمرہ تھا جس میں دری بچھی ہوئی تھی، میز اور کرسیاں بھی تھیں اور طاق میں خوشنما بوتلوں کی قطار رجمی ہوئی تھی۔ رشیدہ نے ایک شربتی رنگ کی بوتل اُٹھالی اور اس کا منہ کھول کر جمیل کے منہ سے لگا دیا۔

"اس کو پی جائیے" شراب کی تیز بدبو سے جمیل سکڑ کر رہ گیا اُف اِس خوشنما کمرے کی حسین بوتلوں میں ناپاک رُوح بند تھی۔ وہ تھرّا اُٹھا اور پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا آپ کو پینے سے اِنکار ہے؟ یہی چیز آپ کو چند منٹ میں اچھا کر سکتی ہے"

"نہیں رشیدہ میں اس کو نہیں پی سکتا۔ مجھے معاف کرو۔ اگرچہ تمہارے ہاتھ سے کوئی چیز لینے میں مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے مگر میں مجبور رہوں۔"

"کیا مجبوری ہیں آپ؟"

"تم نہیں سمجھ سکتیں اس کی عادت بڑی تباہ کن ہے۔"

"خیر آپ کی مرضی۔ اچھا تو اب واپس چلیئے۔"

"ایسی کیا جلدی ہے۔ کیا ہم یہاں بیٹھ نہیں سکتے؟"

"نہیں مولوی صاحب، یہ بڑی خطرناک جگہ ہے۔"

"خطرناک؟"

"جی یہاں انسانوں کے گلے تو نہیں کاٹے جاتے مگر کہیں اور جگہ اُن کو قتل کر کے اُن کا مال یہاں بیٹھکر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہاں بیٹھ کر حکام کو بھاری بھاری رشوتیں دی جاتی ہیں اور خوب شراب لنڈھائی جاتی ہے۔

"اور اس گندے کمرے کی چابی تمہارے پاس رہتی ہے؟ تمہارے پاس؟" جمیل نے حیرت سے پوچھا۔

"جی۔ کیونکہ میں اس مظالم گاہ کی نگراں ہوں، منشی ہوں۔ آپ حیرت سے کیا گھور رہے ہیں۔ ایک ہندوستانی دیہاتی لڑکی کے اِس قسم کے اعمال دیکھکر آپ متعجب نہ ہوں۔ لُوٹ مار، قتل و غارت کرنے والے میرے والد، چچا، ماموں وغیرہ ہی ہیں اور جب مجھے شروع

ہی سے اِس ماحول سے مانوس کیا گیا ہے۔ آپ اس فضاء کے تصور سے کپکپاتے ہیں۔ میں اس کے برعکس اس میں بیحد دلچسپی لیتی ہوں۔ کہیئے اب آپ مجھ سے کس قدر نفرت کرتے ہیں؟"

"نفرت؟ تم سے؟ نہیں۔ لیکن تم نے اپنا یہ خطرناک راز مجھ سے کیوں کہدیا اگر میں ابھی جاکر پولیس کو اطلاع دیدوں؟"

"آپ میں اتنا دم کہاں۔ آپ اپنی اس قدر معصومیت و سادگی کے باوجود مجھے چاہنے لگے ہیں۔ اِس لئے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ کو بھی اپنی ہی جماعت کا ایک فرد سمجھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"رشیدہ تم میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہو۔

"کیا آپ مجھے نہیں چاہتے ہیں مولوی صاحب؟"

"بیحد رشیدہ۔"

"تو پھر آپ قدرتاً گناہ پسند ہوئے۔ اگر آپ جرم سے نفور نہیں ہیں تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ آپ کے اندر بھی مجرمانہ صلاحیت ہے۔" رشیدہ کو اپنی گرفت پر کس قدر یقین تھا۔

"رشیدہ میں تمہیں دل وجان سے چاہتا ہوں مگر اپنے اصول نہیں توڑ سکتا۔ میں صبح ہی اپنی نوکری کو لات مار کر تمہارے قصبہ سے رخصت ہوتا ہوں اور پھر اس وقت آؤنگا جب تم اپنی اصلاح کر چکو گی اور تمہارے یہ لٹیرے رشتہ دار مر چکیں گے۔"

"اس وقت آکر کیا کیجئے گا۔ میری شادی چند ماہ بعد میرے ماموں

زاد بہائی سے ہو چکے گی جو اس جماعت میں سب سے زیادہ جیوٹ ہے؟

"بزدل تو میں بھی نہیں ہوں رشیدہ۔"

"مگر میرا جرم وگناہ پروردہ دل آپ کے ہاں کے پُرسکون ماحول میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ جس طرح آپ کا دم اِس فضا میں گھٹتا ہے اُسی طرح میری جان بھی زندگی کی ملائمت میں نکل جائیگی۔"

"اور بہت سے رفاہی کام ہیں جن میں کافی صعوبت ہے۔"

"مگر ان میں لذت جرم وگناہ کہاں۔"

"شاید تم عقوبت گناہ سے بالکل ناآشنا ہو۔"

"ہاں مجھے اس سے کبھی سابقہ نہیں ہوا۔"

"کیا رشیدہ تم مجھے مطلق پسند نہیں کرتی ہو۔"

"بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر آپ مجھے اپنے قریب آنے کب دیتے ہیں۔"

"اچھا تو کچھ تم کھسکو کچھ میں کھسکوں۔"

"یوں تو ٹکر ہو جائے گی آپ دوڑ کر مجھ سے لپٹ جائیے۔"

اگر میں تمہیں لپٹا لوں تو کیا تمہارے اس گندے حصار کو بھی توڑ ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤنگا۔"

"نہیں اس کے برعکس آپ کو بھی اس حصار میں محصور رہو ناپڑیگا۔"

"یہ مشکل ہے رشیدہ۔"

"ہاں مولوی صاحب مشکل ہے۔ آپ صبح جا رہے ہیں اچھا جائیے

لیکن مجھے نہ بھولئے گا۔"

"رشیدہ۔"

"دیکھئے میری طرف بڑھنے میں آپ کے ٹخنے کیچڑ میں آلودہ ہو گئے ہیں۔"

"اُف میں کیا کروں؟"

"صبح ہو رہی ہے اب چلیئے۔"

"اچھا رشیدہ میں جاتا ہوں خدا حافظ۔ کیا میں تمہاری اِصلاح سے بالکل ہی مایوس ہو جاؤں؟"

"آپ ایسا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں جس سے میں بالکل ہی نا آشنا ہوں۔ اچھا تو مولوی صاحب آپ مجھے بھول نہ جائیے۔" یہ کہکر اس نے بتی گل کر دی اور باہر آنا چاہا۔ اندھیرے میں اس کا گداز جسم جمیل کے جسم سے مس ہو گیا۔ فطری قوانین کی معصیت کو جوش آگیا جو مسئلہ بحث و مباحثہ سے طے نہیں ہو رہا تھا اسکو ایک لمس نے حل کر دیا۔ کردار کی کمزوری گناہ کے گلے لگ گئی۔

جب صبح ہوئی تو ہر طرف نور پھیل گیا مگر اس کمرے میں اب بھی اندھیرا تھا۔

to enchanting ink
from my point of
conception

Dayanand

My soul

Miss. E.R.D.

you are going to be
married in a few days.
What about me. It is
True you never
loved me, you always
hate me, but my greatest
with me instead of
all these mean lessons
I love I will die
for you, don't
think that a boy
is writing this, but
from your girl
student.

Bad

~~I~~

وہی پرانی داستان کہ وہ ایک شریف و معزز گھرانے کی لڑکی تھی، اس کا اغوا کیا گیا اور وہ اب مجبوراً ایک طوائف کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ مگر یہ داستان اس کی زبانی نہیں معلوم ہوئی تھی بلکہ واقعات کی زبان سے سُنی گئی تھی۔ بہرحال وہ حال ہی میں طوائف بنی تھی۔ ناتجربہ کار، ناآموزدہ کار، کچی۔

معدے کے لئے اگر اینِدھن کی بہتات ہو تو انسان کیوں نہ عیش کرے۔ ضروری نہیں کہ عیش کا پہلا سجدہ طوائف کے کوٹھے پر ہی کیا جائے۔ اگر اپنے کمرے کی وسعت اجازت دے تو وہیں بیٹھے بیٹھے کسی کو سامنے رکھ کر اچھے افسانے، بلند نظمیں، اور اعلیٰ ناول لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن محمود کا اَدب گھر سے تھک کر آسودگی کے لئے شیریں کے کوٹھے پر جانے کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا۔

ناتجربہ کار، شریف عیاش ذرا شرمیلے اور بزدل ہوتے ہیں۔ محمود بھی شیریں کے کوٹھے پر جانے میں اپنے دل کو تو آمادہ پاتا تھا لیکن پیروں کو لرزاں۔ صبح کا اُجالا رات کی تاریکی پر غالب آنے میں کس قدر ہیجانی دَور سے گذرتا ہے، دھندلکے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا نورِ ظلمات

میں ایک عارضی صلح ہوگئی ہے۔ کیریکٹر کی سطح پر سے جب انسان پھسلتا ہے تو جہاں بھی جس کو پہلا سنبھالا لائق جائے وہیں وہ آگے بڑھنے کے لئے بیٹھ جاتا ہے۔ محمود پھسلا تو نہ تھا مگر اُس کے پیر ضرور بے قابو ہوگئے تھے، شیریں کے کوٹھے پر وہ پہنچ کر رہا۔ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ دل کو سنبھالے ہوئے، عقل کے پاسبان کے سہارے۔

کوٹھے پر قیمت ادا کر کے شب گذارنے کے اعلان سے شرم و تہذیب پسینے میں نہا اُٹھتی ہے۔ اَب حقیقت کو کس طرح چھپایا جائے۔ محمود کی شب خلوت ایک لمپ سے روشن تھی اور شیریں سے مزین۔ گناہ دروازہ پر کھڑا اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ شیریں کی مُسکراہٹ اُس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ اور محمود کے تیور اس کو باہر ڈھکیل رہے تھے، خوشبو، تنہائی اور دسترس لذت بن کر محمود پر چھانے لگیں۔ اُس نے سُرور کی ایک انگڑائی لی جس کے کیف میں شیریں نے اس کے پہلو میں جگہ لے کر اضافہ کر دیا۔ گناہ شوق کا روپ بدل کر دبے پیر دروازہ میں سے کھسکا، لیکن محمود نے اس کو دیکھ لیا، عقل کے پاسبان نے اس کو ٹوک دیا اور دل کی تمنائیں منہ بسور کر رہ گئیں۔

"نہیں شیریں، بے احتیاطی نہ برتو۔ بیشک تم شب بھر کے لئے میری ہو، مگر ہم اس رات کو انسانوں کی طرح باتیں کر کے بسر کریں گے، بہیمیا نہ نہیں گذاریں گے۔"

یہ انسانیت کی پہلی آواز تھی جو اپنی قیمت پا لینے کے بعد شیریں نے

جسمانی بیوپار کی منڈی میں سُنی تھی۔ چونکہ اس کے پیشے نے نسائیت سے ابھی اختتامی جنگ نہیں لڑی تھی اس لیئے اس پر بھی آدمیت کے آثار طاری ہو گئے۔ اس نے اپنے کو سنبھالا اور اپنی بچی کھچی "عورت" کی آبرو کو بھی سنبھالا۔

"شیریں! میں تمہاری چور چور روح میں سے اپنے افسانہ کیلئے چند ریزے چن لینا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے بے آواز جذبات کو قوتِ صور دینا چاہتا ہوں کہ تم شعر بن کر بلند ہو اور ادب ہو کر پھیلو۔"

"آپ شاید مجھے بنا رہے ہیں۔ میں کس طرح یقین کر لوں کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں سچ ہے۔ مجھ سے کسی مرد نے اس قسم کی گفتگو اب تک نہیں کی ہے۔ آپ ادیب ہیں۔ کیا ادیب دیوانے ہوتے ہیں یا وہ فرشتے ہیں؟"

"تمہارے جملے کچھ بے ربط سے ہیں۔ خیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ادیب و شاعر دنیا میں سب سے زیادہ بے عمل جانور ہیں، چنانچہ میں تم سے غیر ادیب کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ زندگی افسانہ بننے کے لیئے نہیں ہے بلکہ راز رہنے کے لئے ہے۔ میں نے حیات کو ہر جگہ پڑھا اور اس کا آخری مطالعہ تمہارے ہاں کرنے آیا ہوں۔ مگر تم نے خلوت میں آتے ہی ورق اُلٹ دیا۔ غضب یہ ہوا کہ تم میرے لئے کتاب نہ بن سکیں میں تمہارے لئے بن گیا۔ اگر تم نے مجھ سے کام لیا تو میری زندگی کے بدخط کالموں میں اپنے لئے کام کی چیزیں تلاش کر سکو گی۔"

"میں آپ کی گفتگو کو اچھی طرح افسوس نہیں سمجھ سکی ہوں۔ مگر

کوشش کروں گی کہ آج جو آپ اُجالا چھوڑ کر جا رہے ہیں اس میں اپنے قریب کی چیزوں کو دیکھ سکوں ۔"

"ہاں اُفق پر نظریں جمانے کے بجائے اپنے دروازہ کو دیکھنا زیادہ اچھا ہے ۔ اچھا بھائی اب ہم چل دیئے، یہ رات تو ختم ہوتی ہی نہیں ہے ۔"

"خدا کی شان ہے، یہاں کی راتیں آج تک بہت ہی مختصر شمار کی گئی ہیں مگر آج سے ہر نظام بدلا جا رہا ہے، اچھا پان تو کھایئے ۔ آپ نے تو کسی چیز کو بھی نہیں چھوا ہے ۔"

"لاؤ پان تم مجھے اپنے ہاتھ سے کھلا سکتی ہو ۔ میں اتنا پرہیزگار نہیں ہوں کہ تمہارا پان میرے تقوے کو پاش پاش کر دیگا ۔"

"محمود صاحب ! اگر میری زندگی نے کوئی اچھا پلٹا کھایا تو کیا آپ آپ —— !"

"میں کیا ۔ بولو بولو ۔"

"کیا آپ کبھی مجھے مِل سکیں گے ؟"

"شیریں تم نے پھر زندگی کو افسانہ بنانے کی کوشش کی ۔ اوہ ! دیوانی ! اگر تم نے پلٹا کھایا تو ہر شئے پلٹا کھا جائیگی اور تم کو اس کا احساس بھی نہ ہوگا ۔"

"مگر میں آپ کو نہیں بھولونگی، ہرگز نہیں بھولونگی ۔"

"بہت بیوقوف ہو ۔ بہت احمق ہو ۔ احمق میں بھی ہوں کہ تمہاری پیار کی باتوں کا جواب گالیوں سے دے رہا ہوں ۔ مگر تم مجھ سے زیادہ احمق ہو ۔

پلٹنے سے پہلے پروگرام بنا رہی ہو؟"
"آپ مجھے خواہ کچھ ہی کہیں میں تو آپ کو کبھی نہیں چھوڑوں گی"
"کتنا دلچسپ افسانہ ہے عورت کی زبان سے"
اِس ملاقات کے تین چار دن بعد تک شیریں ایک عجیب کیفیت میں مبتلا رہی۔ چونکہ وہ ابھی طوائف کم تھی اور عورت زیادہ اِس لئے اِتنی متاثر ہو گئی تھی۔ اگر وہ ایک طوائف ہوتی تو محمود کی مہمل باتوں پر تنہائی میں خوب قہقہے لگاتی۔

جب ذہنی رجحانات اور دل کی اُمنگوں پر کوئی ڈاکہ مار جاتا ہے تو آدمی کتنا بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ شیریں میں اَب نہ وہ طوائفانہ شیریں ادائی رہی تھی اور نہ پیشہ کی زرین حرص۔ وہ ایک سادہ عورت ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اُس نے سب سے پہلے اپنی موجودہ زندگی سے دست کشی حاصل کی۔ معلوم نہیں وہ احمق ہی تھی کہ ذرا سی بات پر اپنا کاروبار برباد کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یقیناً وہ شریف گھرانہ کی لڑکی تھی اور شرافت کثافت سے دَب کر کبھی کبھی چمک اُٹھتی ہے۔

پہلے تو اس نے سوچا کے سینما میں داخل ہو جائے۔ حسن و موسیقی کی دولت اُس کے قبضہ میں تھی، اس کے علاوہ شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں بھی آجکل وہاں پناہ لے رہی تھیں۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایک گندے تالاب میں عطر کے چند قطرے ڈال دینے سے تالاب معطر ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد اس نے سوچا کہ کسی بھلے آدمی سے نکاح کر لے۔ مگر کوئی

بھلا آدمی اس کارِخیر کے لئے اپنے کو پیش ہی کیوں کرنے لگا۔ ہاں وہ لوگ تو مل سکتے تھے جو اسی منزل کا طواف کیا کرتے ہیں۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ کوئی دوکان کھولے مگر اس پر بیٹھے گا کون؟ اگر وہ بیٹھتی ہے تو عورت ہونے کی ذلت عوام کو یہی سمجھائے گی کہ یہ دوکان حسن ہے۔ نوکری! مگر کہاں؟ کس قسم کی نوکری۔ پھر اس میں عزت کہاں، وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی، اس کے مقدر میں کچھ نہیں تھا، اگر تھا تو وہی طوائف بنا رہنا۔ مگر محمود صاحب کیا کہیں گے!۔

ادب و شاعری! لیکن یہ اس کے بس کی کب تھی۔ پھر ادیب و شاعر بن کر یہاں کس نے اپنا پیٹ پالا ہے۔ تو پھر خودکشی!

اُف! وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اور نہ کچھ کر سکنے کے قابل تھی۔ اول تو عورت کو کچھ کر سکنے کی رعایتیں ہی بہت کم حاصل ہیں اور جو حاصل ہیں ان میں بھی وہ افسوس ناک حد تک ناکام ہے۔ آخر وہ کیا کرے۔ سوچتے سوچتے بالآخر ایک چیز اس کے ذہن میں آئی، وہ کسی رسالہ کا اجرا کیوں نہ کرے، ایک ادبی و علمی قسم کا رسالہ۔ لیکن وہ اس کو کیسے سنبھال سکے گی، اس نے چند عاشقانہ خطوط کے علاوہ آج تک کوئی باقاعدہ مضمون نہیں لکھا تھا۔ مگر ایڈیٹر کو مضمون لکھنے کی ایسی کوئی خاص ضرورت تو ہے نہیں۔ رہا ایڈیٹوریل لکھنا تو بہت سے اڈیٹر صاحبان بھی تو آخر کچھ نہ لکھ کر اپنی نا اہلیت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مضامین فراہم کرنیکا البتہ ایک قصہ رہ جاتا ہے۔ تو اس باب میں وہ اپنے عورت ہونے کی رعایت سے

فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گی، پھر وہ منشی جی آخر کس روز کام آئیں گے جو فارسی کے اچھے عالم بھی ہیں اور اُس کے در پر پڑے بھی رہتے ہیں۔

آخر اُس کے دل میں یہی ٹھن گئی۔ منشی جی سے جب اُس نے قلمی امداد کی درخواست کی تو وہ پہلے وعدہ وصل لینے لگے۔ یہ ایک ہی رہی، اِنہی چیزوں سے بچنے کے لئے تو اُس نے رسالہ نکالنے کی ٹھانی تھی اور وہ اسی سے اُس کے شریف پیشے کی ابتدا کرانا چاہتے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے اُن کو بلا وعدۂ وصل آمادہ کیا گیا۔

اب سب سے پہلا سوال سرمایہ کا رہ گیا تھا۔ اُس نے کچھ زیور فروخت کیا، کچھ پس انداز کی ہوئی رقم سے کام چلایا۔ غرض چند روز بعد پہلا پرچہ نکل گیا ذلیل سا، واہیات سا۔

اچھے لکھنے والے ایک دَم فراہم نہیں ہو سکتے ہیں۔ اور رسالہ کی کامیابی کا دارومدار بیشتر اسی پر ہے۔ آخر اُس کو ایک اُپج سُوجھی، دوسرے پرچے میں منشی جی سے ایک نہایت رنگین غزل لکھوائی اور اس کو اپنے نام سے چھپوایا۔ ایک ستم یہ کیا کہ اپنی حسین تصویر بھی زیب رسالہ کر دی۔ پرچہ زیادہ تعداد میں چھپوایا گیا اور دُور دُور مفت اس کی کاپیاں روانہ کر دی گئیں۔

جنسی بھوک میں ایک اضطرار سا پیدا ہوا۔ آرٹ کی اماں فن پسند دماغوں میں قسم قسم کے بچّے دینے لگی۔ پُر غرور قلموں سے رال ٹپکنے لگی، اَدیبوں کی رگ تعشق پھڑکنے لگی۔ شاعروں کی حس معاشقہ سنسنانے لگی۔

بن کر لکھنے والے بگڑنے لگے اور بگڑے ہوئے لکھنے والوں نے بن کر لکھنا شروع کر دیا۔ غرض شیریں کے تیسرے پرچہ میں تمام ان لکھنے والوں کے مضامین تھے جن کو ایک با اثر ایڈیٹر بھی بعد کاوش لبسیار یک جا نہیں کر سکتا تھا۔

مضامین پر مضامین آنے لگے۔ غزلوں پر غزلیں برسنے لگیں اور نظموں پر نظمیں انبار ہونے لگیں، کوئی تائب اَدب ادیب صاحب لکھتے تھے "شیریں! اپنی جان شیریں کی قسم تمہارا پرچہ تو حاصل رسائل ہے۔ مدت سے لکھنا ترک کر دیا تھا لیکن تم اپنے رسالہ کے صفحات میں چھپ کر ایسی آئیں کہ اپنا عہد مجھے توڑ ڈالنا پڑا۔"

ایک شاعر صاحب رقمطراز تھے "بلبل شیریں نوا باور کرو میری تغزّل اور کہنہ مشقی منتظر تھی کہ تم جیسی ہستی رسالہ نکالے اور آتشیں نغموں کو دُنیا میں بکھیر دے۔"

شیریں اپنی کامیابی پر دل ہی دل میں خوش تھی، اُس کو معلوم نہ تھا کہ لٹریچر کا کیریکٹر اب اس قدر کمزور ہوگیا ہے کہ اس کو ذرا سی قدرت سے جدھر چاہو ادھر مُوڑ لو۔ مگر نہیں اَدب کی اِس کمزور دیوار میں محمود کے کردار کی بھی ایک مضبوط اینٹ موجود تھی۔ آہ وہ کہاں ہیں۔ کاش! وہ اب آکر میری کامیابیوں کو دیکھیں، اَب میں اُن سے مساویانہ حیثیت سے مِل سکتی ہوں۔

دو سال بعد شیریں کے قبضہ میں اپنا پریس تھا، بکڈپو تھا اور دو

ہفتہ وار رسالہ تھے، سرمایہ، شہرت اور عزت مزید براں، منشی جی کا وجود ہوشیار تنخواہ دار کام کرنے والوں کے نرغہ میں گم ہو چکا تھا۔ شیریں کی پچھلی زندگی ادب وصحافت کی ستر پوش چادر کے نیچے چھپ چکی تھی۔ اب اس کے حسن قلم، حسن رقم اور حسن صورت کا آفتاب بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔

جن لوگوں نے کبھی ایک مصرع بھی موزوں نہیں کیا تھا، کبھی ایک سطر بھی صحیح نہیں لکھی تھی، اب تیزی سے ادب وشاعری پر جھکے ہوئے تھے اور شیریں کے رسالہ میں داخل ہو کر کچھ بننے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے تھے، ادب کی ہیئت گدائی شیریں کے آستانہ پر سر ٹیکے پڑی تھی۔ سخن کا سائلانہ ہیولا اُس کے در پر پڑا ہوا شیریں کے دم کی خیر کا غلغلہ بلند کر رہا تھا۔ لیکن غیور نگارش اب بھی چٹان کی مانند اپنی جگہ پر ڈٹی ہوئی تھی۔

شیریں کو معمولی معمولی ادیب اور شاعر سے ملنے کی فرصت نہیں تھی۔ افسانوں اور غزلوں کے طومار میں سے کام کے مضامین چھانٹنے کا وقت نہ تھا، اس کو چند خاص لکھنے والے مل گئے تھے۔

وہ کسی کو انٹرویو کا وقت بہت کم دے سکتی تھی، بات یہ تھی کہ اپنی مصروفیتوں کے بعد اس کا وقت اونچی سوسائٹیوں بلند پارٹیوں اور بڑے آدمیوں میں صرف ہوتا تھا۔

انسان جب زندگی کی تکلیف دہ زنجیروں کو توڑ کر کسی آرام بخش ماحول میں پہونچ جاتا ہے تو پچھلے زندان کے ایک ایک طاق تک کو بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ شیریں بھی حیات کی اس گتھی سے بچ نہ سکتی تھی۔ اب اُس کے حافظہ

میں خوش آئند تصورات تھے، جدید حسین نقوش تھے اور نئی نئی اُمنگیں تھیں۔

ایک دن اُس کو اپنی ڈاک کے انبار میں ایک وزیٹنگ کارڈ ملا جس پر صرف محمود لکھا ہوا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا، دفعتہً مسز رفیع کے ہاں سے ٹیلیفون بولا، مسکرا کر ریسیور اُٹھایا، سلسلۂ کلام اتنا دلچسپ و طویل تھا کہ محمود کا کارڈ اس کے ہاتھوں میں میلا ہوتے ہوتے چند جگہوں سے مسک گیا۔ اور آخر میں نہ معلوم کب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ جب سلسلۂ گفتگو ختم ہوا تو کارڈ اور اس کا خیال اُس کے حافظہ سے نکل چکا تھا۔ مسز رفیع کے چند جمیل فقرے اُس کے متبسم لبوں پر تھے اور آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔

شام کو ایک پُر وقار نوجوان جب سادہ شیروانی میں شیریں کے آفس میں داخل ہوا تو اس کو معلوم ہوا کہ محترمہ مسز رفیع کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب واپس لوٹیں گی۔

"شکر ہے شیریں نے زندگی کے راز کو سمجھ لیا مگر افسوس اس کا ہے کہ اس کو افسانہ بنا کر سمجھا۔" نوجوان کے ہونٹوں سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کر کے نیچے اُتر گیا۔

شیریں

شیریں

SAK

رنجش

[illegible]

جس نے ۹ روپے دلوا دیا مجبوریہ سمجھ کر [illegible]
علاوہ ۱ روپیہ کمائی گئی خرچ دونوں [illegible]

[illegible] 5/8/67

[illegible]

شیریں

رنجش

SAK

"آج دل کی ہر تمنا کیسی آتشبار ہے"

تم قیامت سے زیادہ تند مزاج ہو اور میں شفقت سے زیادہ نرم دل۔ محلہ کے کتے گواہ ہیں کہ میں پچھلی راتوں، راتوں کو کتنی مرتبہ مکان سے گلی اور گلی سے مکان میں داخل ہوتا رہتا ہوں۔ اس مثال سے تم یہ نہ سمجھنا کہ میری بے خوابی کا تماشا صرف کتے ہی دیکھتے ہیں۔ فرشتوں کی تو چونکہ میں نے آج تک شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔ اسلئے میں ان کو شہادت میں پکڑ نہیں سکتا تھا۔

ایک تمہارے نہ ہونے سے مجھے بجلی کی روشنی میں اپنا گھر لحد تاریک معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے تبسم کو یاد کرتا ہوں تو میری ٹارچ اندھی نظر آنے لگتی ہے۔ تمہاری آواز کی یاد آتی ہے۔ تو ریڈیو کے سریلے گانے بھدے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ تمہاری آنکھوں کا تصور کرتا ہوں تو تمہاری آنکھیں ہی یاد آنے لگتی ہیں۔ تمہارے

وہاں تنگ کا خیال کرتا ہوں تو میرے پسیوں کے ٹوٹے
کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اور جب تمہارے پورے قد و قامت
کو یاد کرتا ہوں تو ستار کی جسامت، سارنگی کی نزاکت
اور طبلہ کا تناسب آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔ آخر کب تک
روٹھی رہو گی؟ کب ملو گی، کب بلاؤ گی، اور کب
آؤ گی؟

یہ خط تو کچھ بنا نہیں فرمائشی خط تو ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ بشیر جان محمود سے روٹھ گئی تھیں۔ وہ روتا ہوا میرے پاس آیا کہ اس بت طناز کی خدمت نازیں اس کی جانب سے ایک عریضۂ نیاز لکھدوں۔ خدا جانے لوگوں کو یہ کیوں مغالطہ ہو جاتا ہے کہ ایک ادیب شادی بیاہ کے رقعے، دعوتی خطوط، عاشقانہ مکاتیب اور روٹھی ہوئی طوائفوں کی خدمت میں نیاز نامے وغیرہ سب کچھ لکھ سکتا ہے۔ ایسی ہی چابکدستی سے لکھ سکتا ہے جیسے مزیدار افسانے وہ لکھ لیتا ہے۔

مجھے آج تک کسی طوائف کی خدمت بابرکت میں خط لکھنے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا۔ مگر محمود کی فرمائش سے حیران تھا کہ اس کے روٹھے ہوئے محبوب کو کیا لکھوں۔ بہرحال لکھنے پر مجبور کر دیا گیا تھا چنانچہ مندرجہ بالا خط لکھا اور جب آگے گاڑی نہ چل سکی تو ادھورا لکھ کر ڈال دیا۔ دوسری نشست میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے اس دوران میں اسکی بشیر جان خود من جائیں۔ اور مجھے اس فراق نامہ کی تحریر سے نجات دلا دیں۔

ضربیں

بیوی لاکھ تند خو، بدمزاج اور لڑاکا ہو مگر شریف خصلت میاں کا کبھی جی نہیں چاہتا کہ وہ انتقاماً طوائف کوشی کرے۔ نجمہ کا مزاج کس قدر رواہیات ہے۔ میری اس کی کبھی نہیں بنتی۔ ابھی شادی کو دو برس بھی نہیں گذرے ہیں مگر اس مختصر عرصہ میں ہمارے درمیان سینکڑوں بار جنگ ہو چکی ہے پچھلے ہفتہ کی جھڑپ تو اس قدر زبردست تھی کہ نہ میں اس کا متحمل ہوسکا نہ وہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بگڑ کر میکے چلی گئی اُدھر میں نے ٹھان لی کہ اب عمر بھر اس کی صورت نہ دیکھوں گا۔ پڑی رہیگی اپنے میکے میں۔ کون لڑائی کی مشین کو اپنے گھر بلائے۔ پرواہ نہیں اگر گھر خراب ہوگا۔ میرے دل کو تو چین نصیب ہوگا۔ ادھر اس کو بھی نجات ملیگی اب یہ جو اس کے چلے جانے سے مکان میں خلا سا نظر آرہا ہے یہ بھی چند روز کی بات ہے۔ آس ٹوٹ کر خود زندگی کا سہارا بن جاتی ہے۔ پھر میری زندگی کا تو نہ کبھی آس سہارا تھی، اور نہ نجمہ۔

نجمہ کے جانے کے بعد چند روز تو طبیعت ملول رہی۔ پھر سنبھلتے سنبھلنے لگی۔ مگر یہ سنبھلنا ایسا ہی تھا جیسے کسی گرتے ہوئے مکان کو کمزور لکڑی کا سہارا دینا۔ خانگی زندگی کے قہقہوں کو جمع کر کے اگر گھر کی ششکر رنجیوں پر تقسیم کیا جائے تو نتیجہ عشاریہ سے بھی بہت دور رہیگا۔ زندگی بھی تو ایک مسلسل جنگ کا نام ہے۔ اب یہ جنگ خواہ نجمہ سے ہو یا ہٹلر سے۔

جنگجو میاں بیوی کی زندگی ہوتی خوب ہے۔ اُن کی لڑائیاں

عادتاً ہوتی ہیں۔ واقعتہ کم۔ اس کا اچھا اثر سمجھئے یا برا۔ یہ ہوتا ہے کہ دل کے پرزے آگ پکڑنے سے رہ جاتے ہیں۔

نجمہ نے مجھ سے ایک سخت جملہ کہا میں نے جواباً دو جملے عرض کئے میں نے ایک کہی اس نے پچاس باتیں سنا ڈالیں۔ لڑائی ہوگئی۔ اب جنگ کے پورے اثرات دونوں پر طاری ہیں۔ ہونٹ بھنچتے ہیں پھیلتے ہیں۔ دانت نکلتے ہیں۔ آنکھیں ابھر آتی ہیں۔ چہرے کے عضلات تن جاتے ہیں۔ مگر دل کے حوض میں خدا جانے کتنا پانی بھرا ہوا ہے کہ وہاں تک اس جنگ کے شرارے پہنچکر بجھ بجھ جاتے ہیں۔ دو ایک دن کے بعد کبھی ہاتھ سے ہاتھ مس ہوگیا۔ آنکھیں ذرا مل گئیں۔ تو دونوں کے جسم حریر کی طرح ملائم پڑ گئے۔ لیکن جس قدر ریشم ملائم ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کی رسی سخت اور مضبوط ہوتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محبت کی نرمی کا کرختگی اختیار کرنا ناگزیر ہے۔

اس بار نجمہ سے بری طرح ٹھن گئی تھی۔ میں نے دل سے کئی بار قسمیں دلا دلا کر دریافت کیا کہ آیا اب نجمہ کو پھر یہاں آنا چاہیئے یا نہیں تو اس نے ہر بار انکار کر دیا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو چپ ہوگیا۔

احمق۔ جب اس سے نفرت نہیں کر سکتا ہے تو اس کا نام سنکر بگڑتا کیوں ہے؟

نجمہ کے چلے جانے کے بعد ایک ہفتہ تو میرا اچھی طرح گزر گیا۔ دل کو بے چین بھی تھا۔ احباب کے پاس رات کو جانے کی آزادی بھی حاصل ہوگئی تھی

گھر کی حکومت بھی بلا شرکت غیرے رہ گئی تھی۔ مگر دوسرا ہفتہ کچھ اتنا پر لطف معلوم نہیں ہوا بلکہ ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ گویا ایک سکونِ جامد ہے جس پر انتشار کی ضرب لگانے والا دنیا میں کوئی رہا نہیں ہے۔ زندگی تو ہے مگر بے تکے پن سے پھیلی پھیلی سی جسمیں موجیں اٹھتی ہیں۔ تندی سے خالی۔ ٹکر سے محروم۔ بہاؤ سے عاجز۔

بیس بائیس روز اسی طرح گذر گئے۔ نہ میں نے کوئی خط بھیجا نہ اس نے۔ اس عرصہ میں ٹینس، برج، سینما، احباب اور پارٹیوں وغیرہ سے ناک تک شکم سیر ہو چکا تھا اب تو گاؤ تکیہ سے لگ کر چپ چاپ پڑے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ اور یا اس خاموشی کو پھر "زبان طعنہ" میں کھولنے کو دل مچل رہا تھا۔

محمود بھی میری طرح یا میری حالت سے برعکس صبر کر چکا تھا۔ اس لئے نہ تو اس نے اپنے محبت نامے کا تقاضا کیا اور نہ اس کو پورا کرنیکا اصرار دوسرے روز میں نے چار پانچ خط لکھے صبح نوکر سے کہہ گیا کہ ان کو لفافوں میں بند کر کے ڈاک میں ڈالدے۔ مجھے ایک دوست کی شادی میں ایک دن کے لئے باہر جانا تھا۔

شادیاں چونکہ بار بار نہیں ہوتی ہیں اور مجھے ملی ہوئی تھی آزادی اس لئے ایک دن کے بجائے چار دن باہر شادی میں گذارے۔ چوتھے روز جب رات کو مکان میں داخل ہوا تو تمام مکان کو روشن پایا۔ حیران حیران

اندر داخل ہوا تو نیچے کے کمرے میں کچھ زیادہ سامان پڑا ہوا پایا۔ اتنے میں زینے کی راہ سے اُوپر کے کمرے سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میری ناک کو نجمہ کے مرغوب عطر کی خوشبو سنگھاتا ہوا گذر گیا۔

کیا نجمہ آگئی؟ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میرے دل میں میری اس غیر حاضری پر بازپرس کا خوف اور اُس کی آمد کی خوشی میں دونوں بیک وقت چٹکیاں لینے لگے۔ مگر وہ آ کیسی گئی۔ بن بلائی۔ بغیر منت و سماجت کے؟

میں نے جلد از جلد کپڑے بدلے۔ چہرے پر شادی کی رنگ رلیوں کے اثرات اب تک باقی تھے۔ اُن کو آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر سنجیدگی میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ عینک کے شیشوں کو ذرا دھندلا کیا۔ پیشانی پر ذرا خفیف سے بل ڈالے اور تبسم مسرت جو ہونٹوں پر کودپڑنے کو بے قرار تھا، اس کو منہ میں سگرٹ داب کر قابو میں کیا اس کے بعد اکڑتا ہوا اُوپر پہنچا۔

نجمہ نے بھی میرے مقابلہ کی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ وہی لباس اس کے زیب تن تھا جس کو میں پسند کرتا تھا۔ وہی اداے نشست تھی جس پر میں مرتا تھا۔

میں خاموشی سے دور کرسی پر جا بیٹھا۔ اُس نے آنکھوں میں بے نیازی پیدا کرنے کی ناکام کوشش سے میری جانب دیکھا۔ میری پیشانی شکنوں سے نہ معلوم کب صاف ہو چکی تھی۔ اور سگرٹ کی لگام جو ہنسی یا تبسم روکنے

کے سینے منہ سے لگی ہوئی تھی۔ نہ معلوم کب بائیں ہاتھ میں آگئی۔

"کب آئیں؟"

میں نے کھنکھار بھری آواز میں پوچھا۔

"کل۔ آپ کا خط ملتے ہی چلدی تھی"

"میرا خط؟"

میں نے بکمال حیرانی دریافت کیا۔

"بیوی کو ایسا —— ایسا عاشقانہ خط لکھا جاتا ہے؟" اِس نے کسی قدر شوخی سے کہا۔

"کیسا خط؟ میں نے تو تم کو کوئی خط نہیں لکھا"

"اگر یہ مذاق ہے تو خیر ورنہ میں آپ کو اپنی خودداری سے کھیلنے کی اجازت نہ دونگی" اُس نے کسی قدر ترشروئی سے کہا۔

"نجمہ! قسم لے لو جو میں نے تم کو خط لکھا ہو" میں نے سنجیدگی و حیرت سے کہا "لیکن یقین جانو تم اس طرح بن بلائے آجانے کے باوجود میری نظر میں ذرا سبک نہیں ہوئی ہو۔ بلکہ تم کو دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی ہے"

"مجھے تو معلوم تھا کہ میرا خیر مقدم تحقیر و تذلیل کے ساتھ ہوگا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے خط لکھنے کو تو لکھدیا مگر پھر اکڑپن نے آدبوچا ہوگا۔ اب اس طرح بننے سے کیا فائدہ یہ آپ کا خط جو میرے پاس موجود ہے" اُس نے غصہ سے کہا اور اپنا اٹیچی کیس کھولنے لگی۔

"ہاں ہاں دیکھوں میں بھی وہ خط" میں نے اُس پر جھک کر کہا۔

"یہ لیجئے" اس نے ایک لفافہ میری طرف پھینک دیا۔ کھول کر جو دیکھتا ہوں تو میرے ہوش اُڑ گئے۔

یہ تو وہی خط تھا جو میں نے محمود کی خاطر اُس کی بشیر جان کے لئے لکھا تھا۔ غضب ہو گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میری پوزیشن کس قدر نازک ہو گئی تھی۔ اگر انکار کرتا ہوں کہ یہ خط اس کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ ایک طوائف کے لئے کسی کی خاطر لکھا گیا تھا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ یہی سمجھے گی کہ میں نے اس کی غیبت سے فائدہ اٹھا کر خوب رنگ رلیاں منائی ہیں۔ اور یہ بشیر جان میری ہی آشنا ہے۔

محمود کا تو عذر لنگ ہے۔ اور اگر یہ کہتا ہوں کہ ہاں یہ خط میں نے ہی اُس کو لکھا تھا تو اب تک کے انکار کے کیا معنی۔ یہی معنی کہ میں اُس کے آنے سے خوش نہیں ہوں۔ اور اس کو جلانا چاہتا ہوں۔ اُف خدا!

"کہیئے کیسے مزاج ہیں۔ آپ تو بہت حواس باختہ نظر آرہے ہیں" اُس نے تلخ تبسم سے کہا۔

مجھے حیرت تھی کہ یہ خط نجمہ کے پاس پہنچا کیسے۔ اُف! یاد آگیا میں پچھلے ہفتہ میں کئی بار بعد کشمکش بسیار نجمہ کو خط لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا حتیٰ کہ لفافہ پر اس کا پتہ بھی لکھ چکا تھا۔ لیکن خط لکھنے میں پھر بھی ہچکچا رہا تھا۔ اس روز نوکر نے اپنی ذہانت کے ثبوت میں اس خالی لفافہ کے اندر یہی بچا ہوا خط رکھ دیا تھا۔ جو نجمہ کو جا کر دے آیا۔ میں اگر نجمہ کو خط بھی لکھتا تو کیا اس طرح گر کر لکھتا۔ اس میں ذرا خود داری ہوتی پھر

پھر ایک دم اس کو آنے کی دعوت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ کیا غضب ہوگیا۔ اب میں کیا کروں۔

"اچھا میں سمجھ گئی۔ یہ خط آپنے سوتے میں لکھ دیا ہوگا" اُس نے میرے کھسیانے پن کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ" میرے منہ سے صرف اِتنا نکل سکا۔

"یہ لاحول کس پر پڑھی جا رہی ہے؟" اس نے چتون بدلکر دریافت کیا۔

"اپنے پر۔ میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ خط لکھکر بھول گیا" میں نے خطرناک سچ کو چھپا کر کم خطرناک جھوٹ کی پناہ لی۔

"آپ نے مجھے کچھ ایسا ویسا سمجھ لیا ہے۔ جو بن بلائی آ جاتی" اُس نے اکڑ کر کہا۔

"اجی میں تو آپ کو بڑی زبردست چیز سمجھتا ہوں۔ آپ نے میرے اُوپر احسان عظیم فرمایا کہ عریضۂ حقیر دیکھتے ہی چلی آئیں"

"مگر یہ کیا حرکت تھی۔ مجھے ایسا خط کیوں لکھا؟"

"بات یہ ہے کہ تم یاد بہت آنے لگی تھیں"

"پھر آپ مجھسے لڑا کیوں کرتے ہیں؟"

"تاکہ تم بھاگ جایا کرو۔ اور پھر میں تمہاری یاد کے مزے لیا کروں"

نجمہ۔ شرما کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولئے۔

تین چار دن بعد جب نجمہ سے لڑائی ہوئی اور اس کے دو تین دن بعد پھر جب اس سے صلح ہوئی۔ اس کے ایک ہفتہ بعد پھر جو جنگ ہوئی اور بعد میں دو بار

پھر جو صلح ہو گئی تو میں نے بڑی ترکیب سے اِس خط کی اصلیت سے اُس کو آگاہ کیا۔ نجمہ کی طبیعت تمام تر خشک ہی نہیں ہے بلکہ مزاح پسند بھی واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اُس نے بھی ملازم کی اس یکجب اُگن حرکت سے بہت لطف لیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد سے اس کی رعونت اِس طرح مٹی کہ پھر ہمارے درمیان جنگ نہیں ہوئی۔ اَب ہم لڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو کامیابی نہیں ہوتی۔ تلخی شروع ہونے سے پہلے ہنسی آجاتی ہے۔ مگر زیادہ ہنسنا ٹھیک نہیں ہے۔

"قائم النار" ہنسی کا انجام بخیر نہیں۔ اِس لئے اُس کی بامحل آمد کے لئے اکثر چھڑپیں ضروری ہیں"۔

تعجب ہے کہ نجمہ نے خط میں ستار، سارنگی، طبلہ وغیرہ کی تلمیحات کو کیوں نہ سمجھا تھا۔

Love is Blind

V. Good

دو حادثوں کے درمیان

This is very good song for boys and girlds. It shows us ~~son~~ something about true love. There are some lucky persons who to love true one other. love is blind. ~~not~~ whether a boy or more girld can admit whether ~~they~~ there love is true for each other or some thing else. In the present age when a boy love with a girl. His main wise is desive he and girl is also doing same. We can understand he is our friend. He can help us in misfortunes. If we are in things so we can do any thing in the world. X. Y. Z.

مشکلیں اتنی پڑی ہیں
کہ آسان ہو گئیں
9/8/67

"بیٹی میرا بازو تھامنا ذرا" ایک فربہ اندام بڑھیا نے اِنٹر کلاس کے پائیدان پر پیر رکھکر ہانپتے ہوئے مجھے دیکھکر کہا۔ اور ساتھ ہی ایک بڑا سا بقچہ بغیر اس خیال کے کسی اور پر پڑ گیا تو گھونسے کا کام دے گا ڈبہ میں پھینکدیا۔ ایک جھنکار ہوئی اور روپوں کا بھرا ہوا بٹوہ ہمارے سامنے آگرا "ارے روپئے" میری ایک سہیلی نے بھرے ہوئے بٹوے کی طرف حریصانہ دیکھکر کہا۔

"اُٹھا لو" نسیمہ نے چپکے سے کہا"

"ہشت" میں نے دونوں کو ڈانٹا"

"یہاں جگہ نہیں ہے اماں" نسیمہ نے بڑھیا کی پندرہ سیکنڈ کی لگاتار کوشش جس میں وہ ایک حد تک ڈبہ میں چڑھنے میں کامیاب ہو چکی تھی مسترد کر کے کہا۔

"آجانے دو تمہارا کیا لیتی ہے" میں نے بڑی بی کی دونو کہنیاں پکڑ کر سہولت سے ان کو اندر گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی تملی نے اپنا وزن اس صفائی سے ہلکا کرنا شروع کیا کہ ہر وزنی چیز ہمارے پیروں کو توڑنے سے

ذرا بچاتی ہوئی فرش پر گیند کی طرح لڑھک لڑھک کر بے ترتیبی سے ایک ڈھیر کی شکل اختیار کرتی گئی۔

"یہ کیا بیہودگی ہے" رضیہ نے غصہ سے کہا اس کی دو چوڑیاں ٹرنک کی "انجن درڈبہ" حرکت سے شہید ہوگئی تھیں۔ "تمام میرا ہاتھ ننگا کر دیا"

"مجور پیسے" قلی نے اپنے گراں فرض سے سبکدوشی کے بعد تقاضا کرنا شروع کیا "ایک نہ دیجئے جب تک یہ کمبخت یہاں آکر سامان قرینے سے نہ جما دے"

"رضیہ نے اپنی سفید کلائی پر ملال آگیں نظریں ڈال کر کہا"

"دیوانی ہوئی ہو زنانہ ڈبہ میں قلی کو بلا رہی ہو" میں نے کہا

"اے واہ بڑی آئی مردوے کو گاڑی میں بلانے والی" ایک ادھیڑ عمر کی لکھنوی خاتون نے کہا۔ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی چل دی۔

"پیسے جناب پیسے" قلی نے پائیدان پر کھڑے ہو کر ڈبہ کے اندر اطمینان سے سر ڈال کر مطالبہ کیا۔

بڑی بی نے ایک چونی پلیٹ فارم پر پھینک دی اور اپنے بکھرے ہوئے سامان سے کھینچ تان کرنے لگیں۔ مگر اس کو ترتیب سے جمانا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر بھی وہ اسباب کے پہاڑ کو ایک ہموار پلیٹو کی شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کبھی وہ پسینہ صاف کر کے اِمداد طلب نظروں سے دیکھنے لگتیں تھیں۔ مگر ہم میں سے کوئی

ٹس سے مس نہوا۔ صاف بات تو یہ تھی کہ ہم لوگ نہایت قیمتی لباس پہنے ہوئے تھیں جو کسی طرح اس مہم میں شامل ہونے کی ہم کو اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن مجھ سے نہ دیکھا گیا کہ بڑھیا اس قدر مصیبت اُٹھائے اور ہم بیٹھی رہیں۔ چنانچہ میں نے امداد پیش کی مجھے دیکھکر بادل ناخواستہ نسیمہ نے بھی ہاتھ بٹایا لیکن مغرور رضیہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ وہ اپنی چوڑیوں کا انتقام بڑھیا سے لینے جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر کی گاؤ زوری کے بعد جب سامان درست ہوگیا تو میں نے بڑی بی سے دریافت کیا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں؟

اُنھوں نے ایک بڑی سی گلوری کلّے میں دبائی اور مٹھی بھر چھالیہ مُنہ میں ڈالی۔ اس کے بعد بٹوے کے دوسرے خانے میں سے زردہ کی چٹکی لیکر کھالی۔ اور چند منٹ تک پان کو چبا کر پیک منہ میں بھر کر بیٹھ گئیں۔

بڑی بی باوجود بڑھاپے کے سُرخ و سفید تھیں۔ اُن کا لباس صاف ستھرا تھا۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ اچھے دن دیکھے ہوئی ہیں۔ خیر جب وہ زردہ کا مزا لے چکیں تو فرانٹے بھرتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی کھول کر پیک باہر تھوکی۔ پیک کیا تھوکی گویا اُگالدان لوٹ دیا۔ ڈبہ کے اس سرے سے اس سرے تک خاصی افشاں ہوگئی۔ چند چھینٹیں لکھنوی نما خاتون کے بستر پر بھی آکر پڑیں لیکن شکر ہے وہ اس وقت مصروفِ استراحت تھیں۔

"بیٹی میں لکھنؤ جا رہی ہوں۔ اور تم؟" بڑی بی نے گلوری کی "گلوگیر"

آفت سے نجات پا چکنے کے بعد کہا۔

"ہم بنارس جا رہی ہیں۔ لکھنؤ کی سیر کرنے کا بھی ارادہ ہے۔ کیا آپ کا دولت خانہ لکھنؤ ہی ہے؟"

"ہاں اب تو لکھنؤ ہی سمجھو۔ جہاں انسان کا روزگار ہو وہی اس کا وطن ہے۔"

"تو وہاں آپ کا کیا روزگار ہے؟" نسیمہ نے بے محل سوال کیا۔

"میرا روزگار؟" بڑی بی نے ہنس کر کہا "میرا روزگار کیا ہوتا بیٹی۔ میرے لڑکے کی فرنیچر کی دوکان ہے۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے بڑا محنتی اور کماؤ بچہ ہے۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد نوکری کا خیال تک نہ کیا۔ بڑھئی کا کام سیکھا دو تین سال تک اپنے ہاتھ سے کام کرتا رہا اب خدا کے فضل سے پانچ دس نوکر ہیں مگر پھر بھی باریک کام خود کرتا ہے۔" بڑی بی نے یہ تقریر نہایت فخر کے ساتھ کی۔

گھنٹہ آدھ گھنٹہ بعد زردہ کا خمار کم ہونا شروع ہوا تو بڑی بی نے لمبی لمبی جمائیاں لینی شروع کیں۔ تکیے پر سر رکھ دیا اور دراز ہو گئیں۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔ مجھے بھی نیند آنے لگی۔ چنانچہ میں بھی کھسک کر اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔

ہم لوگ اپنی ایک عزیز سہیلی کی شادی میں میرٹھ جا رہی تھیں۔ یہ ظاہر کرنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ اس پُر نشاط تقریب کا شادی

بخش پروگرام کس قدر مملو از مسرت تھا ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان میں شادی کے مواقع پر کسقدر غیر ضروری طور پر روپیہ صرف کیا جاتا ہے اِس اسراف سے جس قدر دلچسپی کے سامان خریدے جاتے ہیں اس کا نہ تو نفسِ نکاح سے کوئی علاقہ ہوتا ہے نہ دولہا دولہن کی آئندہ زندگی کا نظام اس سے ترتیب پاتا ہے۔ صرف مراسم کے نباہ کی خاطر یہ فضولخرچیاں کی جاتی ہیں۔ میں اگرچہ ان تمام باتوں کے خلاف تھی لیکن اِنسان کا دل کمبخت چونکہ مسرت پسند واقع ہوا ہے، باوجود ان تمام پراگندیوں کو سمجھنے کے جی چاہتا تھا کہ دل کھولکر تمام خوشیوں میں شرکت کی جائے۔ شادی بار بار نہیں آتی۔

رضیہ تو بڑی بی کی صورت سے جلی بیٹھی تھی چنانچہ وہ تو اُن کے پاس تکیہ لگا کر نہ بیٹھی۔ نسیمہ بھی ان کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ وہ بھی رضیہ کی گود میں سر رکھکر اونگھنے لگی میں نے بھی پیر دراز کر دیئے۔ غرض سب پر غنودگی طاری ہو گئی۔

ابھی گھنٹہ بھر بھی اِس حالت میں نہ گذرا ہو گا کہ ہمارے ڈبہ میں ایک دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ایک اِنسانی چیخ! سب بے اختیار چونک پڑے اُف عجیب دردانگیز نظارہ تھا۔ بڑی بی کا ٹرنک جس کو انھوں نے باوجود میری مزاحمت کے مچان پر رکھدیا تھا زور سے گرا عین ان کے اوپر۔ وہ سینے تک اس کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور ان کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں بجلی کی طرح ہم تینوں اُٹھیں اور ہاتھ پر ٹرنک کو اُٹھا کر بڑھیا کو اس کے

پیچھے سے نکالا۔ وہ بیہوش تھیں اُن کے سینے پر جا بجا خون نکل آیا تھا۔ اور ہنسلی ٹوٹ گئی تھی!

"کیا مر گئی؟ زنجیر کھینچو!"

لکھنوی نما خاتون نے سراسیمگی سے کہا۔

نیسمہ نے لپک کر زنجیر کھینچی۔ اِس قدر کہ بندریا کی طرح اس سے لٹک گئی

ریل ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ دفعتہً دھیمی ہوئی اور تقریباً دو منٹ میں بالکل رک گئی۔ شور۔ غل۔ ہلڑ۔ چیخ پکار بچوں کا رونا عورتوں کی خوف زدہ آواز اور تقریباً کئی زبانوں سے نکلا ہوا ایک سوال "کیا بات ہے؟" ایسا لرزہ خیز منظر پیش کر رہا تھا کہ ہمارے دل دہل اٹھے۔ متحرک و منوم دنیا میں ایک ویو قامت انجن کے رکتے ہی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ خواب کی پریاں ڈبوں میں سے نکل بھاگیں اور خوف کے عفریتوں نے مسافروں کے دلوں پر قبضہ کر لیا۔

"کوئی ڈبے سے باہر نہ نکلے" ڈیوٹی پر کے سپاہی کی خواب آلودہ آواز آئی۔ گارڈ نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے اِدھر اُدھر لالٹین چمکائی اور ہراس زدہ لیکن منچلے مسافروں نے ہمارے ڈبے کا رُخ کیا۔ چند سیکنڈ بعد ہماری گاڑی کا دروازہ کھلا اور گارڈ کی انگریزی ٹوپی، اور سپاہی کا صافہ نظر آیا۔ ہم نے برقعے گھسیٹ لئے اور دبک کر بیٹھ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ بھائی صاحب بھی گاڑی رکتے آئیں گے۔ مگر وہ نیند کے بڑے متوالے ہیں، شاید پڑے سو رہے ہونگے۔

گارڈ نے موقع دیکھتے ہی حادثہ کا اندازہ لگا لیا اور بڑی بی کے بیجس جسم کو ٹٹولکر گلے کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا معائنہ کیا' اس کے بعد جن خطرات کی پیش بینی کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا اُس کی نفی کر کے ذرا مطمئن لہجہ میں بولا "ویل یہ بڑھی ٹرنک کے نیچے کیسے آگیا؟"

اس سوال کو مکرر دُھرایا گیا جس میں سپاہی صاحب نے بھی اپنی اردو دانی کے ثبوت میں شرکت فرما کر کہا۔

"بتاؤ خواتینوں کہ ٹرنک کس طرح گر گیا؟" لیکن ہماری جانب سے کوئی جواب نہ تھا۔ آخر لکھنوی نما خاتون نے کہا۔

"ہم کو کیا خبر کیسے گر گیا۔ منع کیا تھا کہ نہ رکھو صندوق اوپر۔"

"تم ہے ان کا آدمی؟" گارڈ نے خاتون سے پوچھا۔

"میں آپ کو آدمی نظر آتی ہوں کیا؟" لکھنوی نما خاتون نے جواب دیا۔

"صاحب کی یہ مراد ہے کہ کیا آپ اُن کے ساتھ ہیں؟" سپاہی نے کہا۔

"اُن کے ساتھ صرف یہ لڑکی ہے" لکھنوی نما خاتون نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔

"بی کچھ ہوش میں ہو" نسیم نے پہلی دفعہ کہا "یہ تمہارے سامنے تنہا پچھلے اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھی ہیں۔ تم میری بہن کو اُن کے ساتھ کیسے بتا رہی ہو؟"

لکھنوی نما خاتون نسیمہ کے اعتراض سے خاموش ہوگئیں۔ گارڈ نے آخر کہا: "پھر ہوسپٹل میں اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟" اس سوال پر سب خاموش ہوگئیں۔

"میں" بے اختیار میری کپکپاتی آواز نکلی۔ اس کے بعد فوراً ہی شادی کی تقریب کی متوقع دلچسپیاں اور رنگ رلیاں میری نظروں کے سامنے آگئیں۔ آہ میں اب اُن کا لطف نہیں اٹھا سکوں گی۔ مجھے ایک بیمار بڑھیا کی نرس بننا پڑے گا۔ لیکن پھر خیال آتا تھا کہ تقریب کی دلچسپیاں مجھے مادی طور پر کیا شئے بخش سکتی تھیں؟ ایک وقتی خوشی اور بس۔ لیکن از راہِ خدا ترسی اس بڑھیا کی تیمارداری فرض انسانی ہے۔ انسان کی زندگی کی قیمت، شادی کی شرکت کے مقابلے میں اپنی تمام مسرتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ میں اپنے اس مبارک فیصلہ پر مستحکم ہوگئی۔

"ہوسپٹل میں اس کو نرس مل سکتا ہے۔ مگر زیادہ کمفرٹ پاس کے آدمی سے ملے گا" گارڈ نے کہا۔

نسیمہ و رضیہ بلا کی طرح میرے پیچھے پڑ گئیں۔ شاباش نبو تیرے دل گردے کو۔ شفا خانہ میں اپنی چہیتی کی تیمارداری کرے گی، اپنے بھیا سے بھی پوچھا ہے۔ بڑی خود مختار رہتی ہے۔ میاں سپاہی ذرا اُن کے بھائی کو تو پچھلے کسی ڈبہ میں سے بلا لاؤ۔ خدا تمہارا بھلا کرے گا۔" رضیہ نے سپاہی سے کہا۔

لیکن دفعتہً دیکھتی ہوں کہ بال پریشان قمیص کے بٹن کھلے ہوئے چہرے سے سخت سراسیگی عیاں۔ بھائی صاحب اندر داخل ہوئے اور بے اختیار بولے "کیا معاملہ ہے؟" اُن کو دیکھکر مجھے تقویت ہوگئی۔ جب اُن کو تمام حادثہ سے آگاہی ہوگئی تو ذرا اطمینان ہوا۔ لیکن رضیہ نے پھر آگ لگادی۔ اُن کو مخاطب کرکے بولی "بھائی ذرا نجو کو سمجھاؤ۔ یہ دیوانی اِس بڑھیا کے ساتھ اس کی تیمارداری کے لئے شفاخانہ جارہی ہے"

مجھے رضیہ کے رُوکھے پن پر تپہا آگیا۔ بگڑ کر بولی "دیکھو رضی میری حمیت اس کی متقضی نہیں کہ اِس بے یار و مددگار ضعیفہ کو جس کو ایک تیماردار کی اشد ضرورت ہے یُوں تنہا شفاخانہ میں سڑنے کو چھوڑ دوں، شادی میں شریک نہ ہونے کا بیشک مجھے افسوس ہوگا لیکن اس افتادزدہ عورت کی خبرگیری میں مجھے زیادہ مسرت محسوس ہوگی۔ انسانی ہمدردی بھی آخر کوئی چیز ہے"

بھائی صاحب مجھے حیرت سے دیکھتے رہے۔ وہ بھی بڑے رحمدل و نیک نفس انسان تھے۔ میرے عزم بالجزم سے متاثر ہوئے اور بولے۔ "نجو کا کہنا دُرست ہے رضی۔ ہم جانوروں تک پر رحم کرتے ہیں۔ یہ تو پھر انسان ہے۔ تم لوگ حمید (نسیمہ کا بھائی) کے ساتھ بنارس جاؤ۔ میں اور نجو اس ضعیفہ کی تیمارداری کے لئے یہیں اُترے جاتے ہیں"

چنانچہ ہم اس اسٹیشن پر اُتر گئے اور بڑھیا کو ایک آرام دہ اسٹریچر پر لٹاکر شفاخانہ میں پہنچادیا اور ہم بھی اس کے ساتھ آگئے۔ صبح تک بڑی بی کو

ہوش آچکا تھا۔ باہوش ہوکر اول تو وہ بہت چکرائیں کہ کہاں آگئیں - پھر یکے بعد دیگرے ان کو تمام واقعات یاد آگئے۔ مجھے اور بھائی کو اپنے قریب دیکھکر متعجب ہوئیں۔ میں نے اُن کی رفع حیرانی کے لیئے جب اپنی موجودگی کی وجہ اُن پر ظاہر کی تو انھوں نے مادرانہ محبت سے ہم دونوں بہن بھائی کو پیار کیا اور بے شمار دعائیں دیں۔ بھائی نے اُن کے لڑکے کا پتہ معلوم کرکے ایک تار فوراً اُس کو بھی دیدیا۔

دوسرے روز تین بجے کے قریب بھائی بازار گئے ہوئے تھے تو ایک شریف صورت نوجوان زنانہ وارڈ کو دریافت کرتا ہوا آیا اور ایک نرس کی رہبری پر دوڑتا ہوا کمرے میں آگھسا۔ مجھے اتنا بھی موقع نہ دیا کہ اپنا دوپٹہ تو سنبھال لیتی - اس کی اس حرکت پر پہلے تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ لیکن وہ اپنی ماں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے اس قدر بیقرار تھا کہ بغیر اِدھر اُدھر دیکھے اُس نے دیوانہ وار بڑھیا کے کوچ کا رُخ کیا۔ میں نے بھی اس کی اس لغزشِ معصوم کو معاف کردیا۔

وہ نظارہ بڑا ہی رقت خیز تھا جبکہ نوجوان نے اپنا وجیہ چہرہ اپنی ماں کے ماوف سینے پر رکھدیا تھا۔ بڑی بی اُس کے مُنہ کو اپنے لبوں تک لیجا کر ماں کی مخصوص محبت کے ساتھ چوم رہی تھیں۔ مجھے اُس پر محبت نظارہ کا زیادہ موقع نہ ملا۔ نوجوان سنبھلا اور کرسی گھسیٹ کر کوچ کے قریب بیٹھ گیا دفعتہً اس کی نظریں میرے سمٹے ہوئے جسم پر بھی پڑیں اور اُس نے کسیقدر حیرت سے دریافت کیا۔

"امّی یہ آپ کے کمرے میں کون خاتون ہیں؟" بڑی بی اس وقت میری موجودگی کو بالکل بھول گئی تھیں، خیال آتے ہی اُنھوں نے ہماری حقیر خدمات کا بڑے مبالغہ کے ساتھ بیٹے سے ذکر کیا۔ پھر مجھ سے بولیں۔ "بیٹی تمہارے بھائی کہاں ہیں، اُنھیں وحید سے ملاؤ نا" میں لیکن شرم سے چُپ چاپ بیٹھی رہی۔

نوجوان نے ایک گہری نظر سے میری جانب دیکھا۔ میں نے اپنے جسم کو اور چھپا لیا۔ چند سیکنڈ تک وہ دیکھتا رہا۔ پھر اپنی ماں سے بُولا۔

"دنیا میں اَب بھی ایسے ہمدرد و غمگسار اِنسان بستے ہیں جو اجنبیوں کے اس طرح بے غرضانہ کام آتے ہیں۔ محترم خاتون میں بصمیم قلب آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہو رہی ہے اِس لئے میں باہر جا بیٹھتا ہوں" یہ کہہ کر وہ اُٹھکر دروازے کی طرف چلدیا۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے اُس کے خوشنما بُشرے کو دیکھا لیکن وہ نیچی نظریں کئے نہایت شرافت سے باہر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بھائی صاحب باہر سے آ گئے۔ اور وحید سے ملاقات کر کے وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ وحید کے آجانے کے بعد بڑی بی کو اَب ہماری خدمات کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے لاتعداد دعاؤں کے ساتھ ہم دونوں کو رخصت کیا۔ بھائی میں اور وحید میں بھی کافی دُوستی پیدا ہو گئی تھی۔ کیونکہ دونوں تقریباً ہم مذاق ہی تھے۔ رخصت ہوتے وقت وَحید نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالی اور میں نے بھی اُس کو گوشۂ چشم سے

دیکھا۔ اِس کے بعد ہم چل دیئے۔

اِس واقعہ کو دو سال گذر گئے۔ میرے حافظہ میں بڑی بی کا اور اُن کے حادثہ کا خیال بھی دھندلا پڑ گیا تھا، بظاہر کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ میں اس واقعہ کو یاد رکھتی۔ میری شادی کے مدت سے مختلف مقامات سے پیغام آ رہے تھے۔ اِن پیغامات نے مجھے اپنے مستقبل کی سوچ میں ڈال دیا تھا۔ رات دن سوچتی تھی کہ شوہر کن صفات کا ہونا چاہیئے جس کے ساتھ پر مسترت زندگی بسر ہو سکے۔

ایک دن بھائی صاحب میرے لئے ایک سنگار میز لائے۔ ابا کو اِن چیزوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرے لئے کپڑا کتابیں اور اسی قسم کی دیگر اشیاء ہمیشہ بھائی صاحب ہی لایا کرتے تھے۔ دراصل اُن کا اور میرا مذاق بالکل یکساں تھا۔ بس ایک بات میں اُن کے اور میرے درمیان اختلاف تھا۔ وہ اُردو شاعری پر مرتے تھے بلکہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور میں تمام رنگین قسم کے اشعار سے جلتی تھی، ہُوا یہ بھی کوئی مذاق ہے کہ ننھے ننھے سے بچے، محلہ کے تمام چھو کرے گا رہے ہیں عاشقانہ چیزیں۔ گلی میں سے گذر رہے ہیں تو ”یا الٰہی مٹ نہ جائے دردِ دل“ الاپ رہے ہیں۔ بازار جا رہے ہیں تو ”مر یجان مانگی تو کیا تم نے مانگا“ کی تانیں اُڑائی جا رہی ہیں۔ اگر کوئی غیر قوم اور غیر ملک کا انسان ہمارے محلوں میں آ کر آباد ہو جائے اور ہماری اس لغو شاعری پر کبھی غور کرے تو وہ دل میں یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو گا کہ ہندوستانی نہایت ہی پر بہمیت لوگ ہیں اور اُن میں یورپ سے بھی

زیادہ عشق و عاشقی کا رواج ہے۔

"ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا"

کی قسم کی نظمیں اِس قدر کم ہیں کہ وہ سنجیدہ طبقہ سے منتقل ہو کر کبھی عوام تک آتی ہی نہیں ہیں۔

خیر تو بھائی صاحب میز لائیے۔ بڑی نفیس تھی' جب میں نہایت شوق و اِنہماک سے اِس کا معائنہ کر رہی تو کمپنی کی مہر پر میری نظر پڑی' ایک پیتل کی خوشنما تختی تھی جس پر "وحید اینڈ کو لکھنؤ" کندہ تھا" وحید ... ... ؟ لکھنؤ ؟ ؟" بے اختیار میری زبان سے یہ دو نام نکل گئے۔ اِس کے بعد ریل کا سفر' بڑی بی' حادثہ' شفا خانہ اور آخر میں وحید —— وحید مع اپنی وجاہت کے میری نظروں کے سامنے تھا۔

" وحید اینڈ کو. لکھنو۔ یہ میز وحید کے کارخانہ کی ہے۔ اُن کی والدہ نے کہا تھا کہ نازک کام وہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ اُن کے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہو" آہستہ آہستہ میری زبان سے نکلا۔ میں نے مناسب جگہ میز کو رکھدیا اور فوراً ہی اُس کو ضروری اشیاء سے سجا دیا' اِس کے بعد اُس کے سامنے کھڑی ہو کر نا معلوم کیا کیا سوچنے لگی۔ اَب بڑی بی اور حادثہ دونوں کا خیال فرسودہ سا ہو چکا تھا لیکن اِس میز کے بنانے والے کا خیال بالکل ہی نیا تھا اور ہلکی ہلکی لذّت بخش رہا تھا جس قدر میں اِس خیال میں پختگی محسوس کرتی تھی اُسی قدر لذّت میں اِضافہ اور سرور میں زیادتی پاتی تھی۔ یہ دونوں باتیں غیر اختیاری تھیں۔ میں بالعمد میز کے کاریگر

کے خیال میں منہمک نہیں ہو رہی تھی بلکہ میز مجھے اپنے صناع کے تصور میں غرق کئے دے رہی تھی۔ وہ اس کا شفاخانہ میں دراتا ہوا چلا آنا اور اپنی مادرِ مہربان کے سینے پر پیار سے سر رکھ دینا۔ اس کے بعد میری تکلیف کے خیال سے شریفانہ باہر چلا جانا۔ یہ تمام باتیں اس وقت میری نگاہوں کے سامنے تھیں۔

رات کو سوئی تو اسی کیف آور تصور کے ساتھ۔ جیسے میز کے سامنے کھڑی ہوں اور اسے دیکھے جا رہی ہوں۔ وحید مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ یہ میز تم کو پسند ہے نا؟

اسی خیال میں سو گئی۔ خواب میں دیکھتی ہوں کہ امّی چیخ رہی ہیں اور بھائی صاحب کو کوس رہی ہیں کہ ایسی ردّی میز کے لئے پیسے برباد کرتا پھرتا ہے۔ انھوں نے کچھ جواب دیا تو امّی کو تاؤ آ گیا۔ اٹھا کر صحن میں پھینک دی۔ لیکن بھائی صاحب نے فوراً اس کو ہاتھ پر سنبھال لیا۔ یوں میری محبوب میز ٹوٹنے سے بچ گئی۔

صبح اٹھتے ہی فوراً کمرے میں گئی اور ایک سفید کپڑے سے اس کو نہایت احتیاط سے صاف کرنے لگی۔ بجائے اس کے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر سنگار کرتی۔ الٹا میز کا سنگار کرنا شروع کیا۔ غرض کئی روز میری یہی حالت رہی۔ ایک روز صبح اس کے سامنے کھڑی ہوئی چوٹی گوندھ رہی تھی۔ ہیر کلپ لگا کر جو اپنے چہرے کو دیکھتی ہوں تو بالکل قریب، بہت ہی پاس کیا دیکھتی ہوں کہ وحید کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں۔ انھوں نے

اپنی حسین ٹھنڈی ہلکے سے میرے شانے پر رکھ رکھی ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کا حلقہ بنائے مجھے اُن کے بیچ میں لئے کھڑے ہیں۔ میں نے گھبرا کر جو پیچھے دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ میں اکیلی کھڑی تھی اور چوٹی کا سرا میرے ہاتھ میں تھا۔

اس طلسم خیال کے ٹوٹنے کا بڑا افسوس ہوا۔ پھر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بہتیرا چاہا کہ وحید پھر میرے پاس اسی طرح آکر کھڑے ہوں۔ مگر اب وہ شاید میری اگلی احمقانہ سراسیمگی سے ناخوش ہو گئے تھے۔ نہیں آئے۔ شام کو گلی میں سے ایک بچّہ گاتا ہوا گذرا۔ میں کبھی اِن شہدوں کے گانے اور الاپنے پر دھیان نہیں دیتی تھی لیکن آج یہ ناشدنی ایسا شعر گا رہا تھا گویا مجھ ہی سے باتیں کر رہا ہو۔

اس قدر تیرا تصور کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں تو منہ تیرا نظر آتا ہے

سچ کہتا ہے کمبخت۔ اور آج سے پہلے جو کچھ یہ لوگ بک چکے ہیں سب سچ تھا!

میں نے ابھی تک بھائی صاحب سے بھی نہیں کہا تھا کہ یہ میز کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ کئی بار جی میں آئی کہ ان سے تو کہہ دوں کہ یہ میز آپ کے دوست وحید کے کارخانے کی بنی ہوئی ہے۔ شاید اسی طرح میری وحشت میں کمی آجائے۔ مگر پھر خیال آتا کہ ایسا نہ ہو وہ کہیں شک گرفتہ ہو جائیں۔ اس خیال سے چپ ہو گئی، دوپہر کو جب وہ میرے لئے ایک کتاب لائے تو

میں نے بلا ارادہ اُن سے کہدیا "بھائی صاحب یہ میز تو بہت اچھی ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے؟"

"نہیں تو۔ یہاں فرنیچر کی ایک نئی ایجنسی قائم ہوئی ہے، چنانچہ میں اور قاسم (رضیہ کا بھائی) ایک ایک سنگار میز خرید لائے۔ تمہاری رضیہ کے پاس بھی ایسی ہی میز ہے۔ لاؤ دیکھوں کس کمپنی کی بنی ہوئی ہے؟" یہ کہہ کر وہ دیکھنے اُٹھے۔ اور پتہ پڑھ کر ایک دم چونک اُٹھے "ایں وحید؟ واہ رے کاریگر۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ یہ اسی نے بنائی ہو۔ تم نے خوب خیال رکھا ناظرہ۔ میں کل ہی اس کو خط لکھتا ہوں کہ تمہارے کارخانے کی ایک حسین میز ہم نے بھی خریدی ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ میں بھی عجیب نسیان کا انسان ہوں۔ مدت سے اس کو کوئی خط ہی نہیں لکھا ہے" یہ کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔

وحید کو خط لکھنا تو مجھے چاہیئے کیونکہ میز میری تھی اور پسند بھی مجھ ہی کو زیادہ آئی تھی گر حیا مانع تھی۔ وہ دل میں کیا کہیں گے کہ عجیب بے باک لڑکی ہے اس خیال سے چپ ہو گئی۔

بعض دفعہ میں اپنی حالت کا خیال کر کے خود بخود شرمانے لگتی۔ وحید میں آخر ایسی کونسی بات تھی کہ میں اپنی خرم زندگی کے آزاد لمحات اس کے خیال میں مٹ کر مکدر کئے جا رہی تھی۔ بظاہر کوئی خاص نہ تھی۔ میں نے دل پر جبر کرنا شروع کیا۔ ضبط سے کام لیا، عقل کو کام میں لائی اور جذبات کو بودی دنیا سے رُوگردانی کی، میرے اندر ایک قسم کی تسکین سی پیدا ہونے لگی اور

صفر ہیں

چند روز بعد وحشت میں بھی ایک گونہ کمی آگئی۔ اگر کوئی شخص جذبات کی غلط رہبری سے منحرف ہونے میں کامیاب ہو جائے تو وہ بھی میری طرح سکون حاصل کر سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی شادی کی فکر بھی اس قدر نہیں رہتی تھی جس قدر پہلے تھی۔ کہیں بھی ہو جائے۔ میں سمجھوں گی کہ جہاں دنیا میں اس قدر حشرات الارض پیدا ہوتے ہیں اُن میں ایک میں بھی ہوں چاہے مجھے کوئی پیر سے کچل ڈالے چاہے زندہ رہنے دے۔ لیکن بشریت یہ میرے غرورِ بشری کو ٹھیس لگاتی۔ نہیں اس کو اکساتی اور میں سوچنے لگتی کہ جب میں انسان پیدا ہوئی ہوں تو مجھے اِنسان ہی کی سی زندگی گذارنی چاہیئے۔ جانوروں کی سی نہیں۔ لیکن کس کے ساتھ ؟ کسے باشد نہیں صرف وحید باشد !

بہر نوع میں نے وحید کے دراندازِ تصوّر کی اب اگلی سی پذیرائی کرنی ترک کر دی تھی۔ کبھی کبھار خیال آجاتا تھا لیکن جب آتا تھا تو ناسوا، اپنے اثرات کے دل کے گوشے گوشے میں سے ضبط وتحمل، تعقل وخودداری کے ذرات کو نکال باہر کرتا۔ میں اِس جذباتی آندھی سے مدتوں نہیں سنبھلتی۔ خدا خدا کرکے پھر اگلا سکون حاصل کرنے میں کامیاب ہو پاتی تھی۔

چھ ماہ اسی دار وگیر میں گذر گئے۔ الٰہ آباد میں ایک عظیم الشان آل انڈیا سودیشی نمائش ہونیوالی تھی۔ بڑے زوروں کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ آخر وہ دن بھی آگیا۔ نمائش شروع ہوئے چوتھا روز ہوگا کہ بھائی صاحب نے شام کو اِصرار کیا کہ میں بھی اُن کے ہمراہ چلوں۔ میں نے رضی و

نسیمہ کو بھی بلوا لیا۔ غرض رات کو بھائی صاحب قاسم۔ حمید، نسیمہ، رضیہ اور میں نمائش میں پہنچے۔ بڑا اژدھام تھا۔ نہایت عمدہ عمدہ دوکانیں تھیں۔ نسیمہ ایک ایک چیز کی تعریف کر رہی تھی اور ساتھ ہی اپنے بھائی سے خریدنے کے لئے ضد بھی کئے جا رہی تھی۔

ہم شیشے کا سامان دیکھتے ہوئے کپڑے کی دوکان کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی کے بھاگتے ہوئے آنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد آنے والا بھائی صاحب کے کوٹ کا کالر پکڑ کر بولا "ہو کو بڑے نالائق۔ میں نے پچاس آوازیں دے ڈالیں مگر آپ ہیں کہ کانوں میں انگلی دیئے چلے جا رہے ہیں"۔

بھائی صاحب نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ارے کہہ کر وحید سے لپٹ گئے۔ رضیہ و نسیمہ بھی اپنے اپنے برقعہ میں کلبلائیں اور اس برہنہ سر صرف قمیص و پاجامہ پہنے ہوئے نوجوان کو حیرت سے دیکھنے لگیں۔ میرے منہ سے ایک مسرت و حیرت کی چیخ نکلنے والی تھی لیکن میں نے جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ارے یہ یہاں کہاں؟ بھائی صاحب نے قاسم و حمید سے بہت زوردار الفاظ میں وحید کا تعارف کرایا اور ادھر چپکے سے میں بھی اپنی سہیلیوں کو بتایا کہ وہ کون ہے۔

"کیا تم بھی اپنی دوکان لائے ہو وحید؟"

"نہیں تو جیب کترنے یہاں آگیا ہوں" وحید نے کہا۔

"تم ہو تو نرے کودن۔ دیکھتے نہیں ہو یہ محض قمیص میں ہیں۔

ایسا ایٹ ہوم دوکان والا ہی ہوسکتا ہے۔"
قاسم نے بھائی صاحب سے کہا۔
"آپ تو ہیں پ ح - غ - د - کیا ایک بھٹیارا نہیں ہوسکتا تمیس میں؟"
بھائی صاحب نے کہا۔
"مگر سرخیل بھٹیاران کیا بھٹیارے کے دوکان نہیں ہوتی ؟"
وحید نے بھائی صاحب سے کہا۔غرض اُن کو سب نے ملکر خوب بنایا۔ دفعتہً وحید نے ہم تینوں (جو ان سے علیحدہ جا کھڑی ہوئی تھیں) کی طرف دیکھکر کہا۔

"میں ان خواتین کی خدمت میں آداب بجالاتا ہوں اور اگر اُن میں ہماری محسنہ صاحبہ بھی شامل ہیں تو اُن کی خدمت میں ایک رکوع ممونیت ـــــــــ"

وحید کو اپنی "محسنہ" پہچاننے میں اَب دقت نہ رہی تھی اُس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی میرے جسم میں سرور کا تشنج و مسرت کی کپکپی پیدا ہوگئی اور میں شرماکر اپنی سہیلیوں کے پیچھے جا چھپی۔
وحید ہم سب کو اپنی دوکان میں لے گیا۔ اُس کے شو روم میں گاہکوں کا اجتماع تھا۔ لیکن وہ ہم کو اپنی پرائیوٹ جگہ میں لے گیا۔ کرسیوں کی تو کمی ہی نہ تھی۔ قیمتی صوفوں سے لیکر معمولی اسٹول تک موجود تھے۔
"کیا ہوئے گے ؟" وحید نے بھائی صاحب کے شانوں پر زور دیتے ہوئے دریافت کیا۔

"پہلے سگریٹ پھر از قسم ٹھنڈا پانی۔" انھوں نے کہا۔

"اس کے یہ معنی کہ تم کو پیاس ہی نہیں ہے۔ ورنہ پہلے پانی مانگتے۔" وحید نے کہا۔

"نہیں جناب یہ صفت رانچہ کفت کے خیال سے انھوں نے پانی کا نام لے دیا ہے۔ آخر ان نے سوچا کہ آپ اتنے تو کیا بداخلاق ہوں گے کہ محض پانی پر ٹالدینگے۔ پلائیں گے تو سوڈا آئسکریم یا لیم جوس۔" قاسم نے ہنستے ہوئے وحید سے کہا۔

"وحید تم اس کے چکے میں نہ آنا۔ یہ اس وقت میرے کندھے پر رکھکر بندوق چھوڑ رہا ہے۔ اپنی خواہش آئس کریم کا کس مزے سے اس نے اظہار کیا ہے۔ امید ہے تم باوجود بیوقوف ہونے کے سمجھ گئے ہوگے؟" بھائی صاحب نے کہا۔

غرض چھ گلاس آئے تین ہمارے اور تین ہمارے بھائیوں کے لئے۔

"اور تم؟" بھائی صاحب نے وحید سے دریافت کیا۔

"آچھیں" اس نے اُن پر چھینکتے ہوئے جواب دیا۔ "بڑے زور کا نزلہ ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا ویپکس کا رومال ناک سے لگالیا۔

میں جرعہ جرعہ اپنا گلاس ختم کر رہی تھی میرے سامنے ایک بڑا سا شیشہ تھا جس میں وحید کا ہر رُخ صاف نظر آ رہا تھا۔ اور ہر رُخ سے اس وقت

نہایت ہی وجیہ نظر آرہا تھا۔ میں دیوانہ وار اُس کو شیشے میں دیکھے جا رہی تھی۔ نسیمہ نے چپکے سے کہا بھی کہ کیا اپنی پھبن شیشے میں دیکھ رہی ہو؟" اس خیال سے کہ کہیں وہ نہ آمرے میرے نزدیک میں نے جواب ہی نہیں دیا۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ وحید کے سامنے بھی کوئی آئینہ ہے اور اس میں وہ میری اشتیاق کی دنیا کو پلٹا ہوا دیکھ رہا ہے۔ نہ میں بھائی صاحب کی طرف دیکھوں نہ مجھے معلوم ہو کہ یہ جو کبھی کبھی آئینہ میں نظریں ملجاتی ہیں در اصل یہ اُن کا اصلی معانقہ ہے پھر تو میں نے گھبرا کر آنکھیں نیچی کرلیں اور ذرا کھسک کر بیٹھ گئی۔

جب ہم کو یہاں آدھ گھنٹہ ہو گیا تو بھائی صاحب نے کہا۔ لو میاں اَب ذرا نمائش کی سیر کریں۔ چلو وحید تم بھی۔"

"ان کا کیوں ہرج کرتے ہو" حمید نے کہا۔ اس کے بعد اس نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا" چلو بھئی اُٹھو تم لوگ بھی۔"

"نسیمہ لیکن تھک گئی تھی اس نے اپنے بھائی سے کہدیا کہ وہ بہت تھک گئی ہے۔ میری تو دلی تمنا تھی کہ اَب یہاں سے اُٹھوں ہی نہیں، چنانچہ دل ہی دل میں نسیمہ کو دعائیں دینے لگی۔

"ان لوگوں کو تو کبھی ساتھ لانا ہی نہیں چاہیئے" حمید نے کہا

"کیوں کیا ہوا تھک گئیں۔ خیر اُن کو یہاں آرام کرنے دو۔ آؤ ہم ہی ذرا چکر لگا آئیں" قاسم نے کہا۔

" کیوں بھائی ہم جائیں تم کو کوئی عذر تو نہیں " بھائی صاحب نے ہم سے پوچھا۔ ہم نے بیک زبان نہیں کہدیا "

ان لوگوں کے ساتھ ہی وحید بھی باہر چلا گیا۔ ہم نے برقعے سر سے سرکا لئے اور اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

" ناظرہ وحید ہے تو شکیل " نسیمہ نے مجھ سے کہا "

" تو پھر کیا ارادہ ہے ؟ " رضیہ نے اس سے پوچھا۔

" یہ تو اسی سے پوچھو " نسیمہ نے جواب دیا۔

" تم تو ہو دونوں دیوانی —— مجھے —— میں —— وہ " مگر میں اس پیام مسرت کی تردید میں کچھ نہ کہہ سکی۔

" کچھ لکھا پڑھا ہے ؟ " نسیمہ نے پھر کرید کرنی شروع کی۔

" وا اجبی سا معلوم ہوتا ہے " رضیہ نے مجھے چھیڑنے کو کہا۔

" تمہارا سر۔ گریجویٹ ہے " میں باوجود ضبط کے تفاخر نہ چھپا سکی۔

" اچھا جی ؟ " نسیمہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

" خوب! یہ میری ننھی کو کس طرح پتہ چلا ؟ " رضیہ نے اُس کے تمسخر میں شرکت کرتے ہوئے کہا

" تم دونوں تو ہو کوڑھ مغز۔ تم کو یاد نہیں بڑی بی نے ریل میں خود کہا تھا کہ وہ —— "

دفعتہً دونوں کو یاد آگیا۔ مگر یہ کب ماننے والیاں تھیں، پھر میرے

چٹکی لینے لگیں۔

اِس محفوظ جگہ میں گرمی سخت تھی۔ ہم پسینے پسینے ہوئی جا رہی تھیں۔ میں ایک ردّی اخبار سے اور رضیہ نسیمہ اپنے برقعے کے دامن سے پنکھا جھل رہی تھیں کہ اِتنے میں وحید بجلی کا پنکھا لئے اندر داخل ہوئے۔ رضیہ و نسیمہ الماری سے لگی بیٹھی تھیں اِس لئے محفوظ تھیں۔ میں ہی کمبخت بالکل سامنے تھی۔ وہ جو آئے تو ہماری چار آنکھیں ہو گئیں۔ میں نے جلدی سے برقعے کا پلّو اُونچا کر لیا اور میری سہیلیوں نے بغیر یہ جانے کہ کون آیا میری تقلید کی۔

"آپ کو اور تو کسی شئے کی ضرورت نہیں؟" اس بار اُنھوں نے براہ راست مجھ سے دریافت کیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا کہ کوئی جواب دے مگر وہ دونوں تو گویا منہ سی کر بیٹھ گئیں تھیں۔ آخر میں نے ہی کہا۔ "نہیں۔ شکریہ۔"

"امّی کو معلوم نہ تھا کہ ایسی سعید ساعت بھی آئے گی کہ میں آپ سے ملاقات کر سکونگا۔ ورنہ وہ ضرور آپ کو دعا کہتیں۔ ہر دم اُن کی زبان پر آپ کا ہی نام رہتا ہے۔" وحید بولے۔

"آپ میری جانب سے اُن سے سلام علیک کہدیجے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

رضیہ و نسیمہ میری طرف آنکھیں چمکا کر مسکرائیں۔ میں اُستے

کچھ اور کہنے والی تھی کہ اُن کی اس حرکت سے میری آواز بند ہو گئی۔ چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد وحید چلے گئے۔

"امّاں کی زبان پر ہر وقت آپ ہی کا نام رہتا ہے۔ اور بیٹے کا کیا حال ہے؟" نسیمہ نے وحید کے فقرے کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔ رضیہ نے قہقہہ لگایا اور میں بھی ہنس پڑی۔

آدھ گھنٹے بعد ہمارے بھائی صاحبان بھی آ گئے اور بھائی صاحب وحید کو دوسرے روز اپنے مکان پر مدعو کر کے ہم کو لیکر روانہ ہوئے۔

دوسرے روز وحید دوکان چھوڑ چھاڑ پانچ بجے شام کو آدھمکے یہاں حمید و قاسم پہلے ہی سے موجود تھے۔ نسیمہ و رضیہ کو بھی میں نے بلا لیا تھا۔ تھوڑی دیر تک برج اُڑتا رہا تھا، اس کے بعد وحید نے بھائی سے پوچھا "اچھا اَب کھانا کس وقت کھلواؤ گے بھوک لگ رہی ہے؟"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ تم دعوت کا نام سنکر صبح ہی سے فاقہ شروع کر دو گے ورنہ جلدی ہی انتظام کرتا۔ بھائی صاحب نے کہا۔

"آپ کو وحید صاحب کچھ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے؟" قاسم نے دریافت کیا۔

"بیحد"، وحید نے کہا، "سنائیے کچھ اپنا کلام۔"

"میں تو شاعر نہیں ہوں۔ ہمارے دوست مجید (بھائی صاحب)

شاعر ہیں" قاسم نے کہا۔
واقعہ یہ ہے کہ خوب شعر کہتے ہیں۔
"شعر کہتے نہیں ہیں بلکہ جنتے ہیں" حمید نے کہا۔
"ہر نوع تجھ بانجھ سے تو اچھا ہوں" بھائی نے کہا۔
" اے بی ہم تو تمہارے ہی بال بچوں کو دیکھکر خوش ہو لیا کرتے ہیں۔ اللہ تمہارے ہی سہاگ کو قایم رکھے" حمید نے جواب دیا۔ سب ہنسنے لگے۔
"اچھا میاں مجید کچھ سناؤ" وحید نے بھائی سے اصرار کیا۔
"بھئی ہمارے پڑھنے کی طرز اچھی نہیں ہے۔ قاسم سے گواؤ ہمارا کلام" بھائی نے کہا۔
"گواؤ؟ کیا قاسم صاحب گانے سے بھی واقف ہیں۔ یہ تم نے پہلے کیوں نہ کہا۔ اچھا مولوی قاسم صاحب سنائیے مجید کا کلام"
"دیکھو بھئی اگر کلام برا ہو تو میں داد سے محروم نہ کر دیا جاؤں" قاسم نے کہا۔
"تمہارے بھیا گوئیے بھی ہیں؟" میں نے رضی سے کہا۔
"یہ تو خاندان کا خاندان مراثی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟" نسیمہ نے رضی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔
"چپ بھی رہو ذرا۔ بھیا شروع کر رہے ہیں" رضیہ نے اپنی خفت مٹانے کی غرض سے کہا۔

"ذرا سنبھل کر گائیے گا آپ کا گانا براڈ کاسٹ کیا جائے گا۔"
بھائی نے قاسم سے کہا۔

قاسم نے مسکرا کر بھائی کی ایک غزل گائی اور خوب گائی بہت دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ کھانے کا وقت آگیا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم سب کے سب پھر نمائش میں جا پہنچے۔ پھر حسب سابق وحید کی دوکان پر آرام کیا۔ اور چلتے وقت اُنھوں نے رضیہ و نسیمہ کو ایک ایک نہایت قیمتی آبنوسی صندوقچہ اور مجھکو ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی سنگار میز دی۔ ہمارے بھائیوں نے بہت انکار کیا مگر وحید کا اصرار سب پر غالب آگیا۔ ایک ہفتہ اسی طرح مسرت سے گذر گیا۔ اس کے بعد وحید چلے گئے۔

ایک روز میں اپنی نئی سنگار میز پر خرافات جما رہی تھی کہ ایک دراز کو جو کھولا تو اس میں باحتیاط ایک لفافہ رکھا دیکھکر سخت حیران ہوئی۔ پہلے تو خیال ہوا کہ شاید وحید کے کاروبار کا کوئی لفافہ غلطی سے اِس میں آگیا ہے۔ اِسی خیال کے ساتھ اُس کو نکال کر پڑھا۔ لیکن یہ دیکھکر کس قدر حیرت ہوئی کہ وہ میرے ہی نام تھا۔ اِس میں تحریر تھا۔

"میری محسنہ

آپ اس خط کو اپنے نام دیکھکر شاید متعجب ہونگی لیکن اِس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، میں ایک

صاف اور سیدھی سی بات آپ کی خدمت نازیں عرض
کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ میری عزّت افزائی میں اپنی
کسرِ شان نہ سمجھیں تو میں بھائی مجید کو آپ کی مجھ سے
نسبت کر دینے کے متعلق خط لکھوں۔ اُمید ہے آپ
میرے اِس روکھے پھیکے خط سے ناراض نہ ہونگی۔"

وحید"

واقعی کس قدر روکھا پھیکا خط ہے۔" میں نے خط کو تہہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر صرف اِس خیال سے کہ وحید کی تحریر ہے پھر پڑھا۔ پھر پڑھا۔ کئی بار پڑھا۔ دفعتًہ میری نظر خط کے کونہ پر پڑی جس کو بیخودی میں میں نے دیکھا بھی نہ تھا۔ وہاں لکھا تھا:۔

" ناظرہ میں تم کو پیار کرتا ہوں، دل وجان سے تم کو چاہتا ہوں۔"

اِس فقرے کو پڑھکر جس قدر مسرت مجھے ہوئی وہ وحید کے تمام خط سے نہیں ہوئی تھی۔ آہ محبت! کیسا میٹھا بول ہے۔ وحید تم مجھے چاہتے ہو تو میں بھی تم کو کہتے کہتے میں اپنے آپ سے شرما گئی۔

وحید میرے جواب کا اِنتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر میں اُن کو لکھتی تو کیا لکھتی۔ خاموش ہو گئی۔ ایک روز میں اُمی، اَبا اور بھائی کھانا کھا رہے تھے کہ ایک تار آیا۔ ہماری اُمی بڑی کمزور طبیعت کی اِنسانی ہیں۔ لقمہ ہاتھ کا ہاتھ میں رہ گیا۔ بھائی صاحب نے جلدی سے تار پڑھا اور اُن کی زبان سے

ایک اندوہگیں لہجہ میں صرف اِس قدر نکلا "افسوس بُرا ہوا" اَبا جواب تک صبر سے تار مضمون کا اِنتظار کر رہے تھے ضبط نہ کر سکے انھوں نے بھی جھپٹ کر تار اُٹھایا اور پڑھکر بھائی سے بولے "یہ وحیدان کون؟ اچھا وہ تمہارے دوست؟"

ہائے میرا کلیجہ منہ کو آگیا۔ کیا خدانخواستہ اُن پر کوئی اُفتاد آپڑی؟ کس سے پوچھوں کس سے نہ پوچھوں؟ والدین کی موجودگی قیامت تھی۔ شکر ہے بھائی نے یہ فقرہ کہہ کر میری پریشانی اور اُلجھن کو ہلکا کر دیا "جی ہاں۔ وہی ان کی ہی والدہ کا اِنتقال ہو گیا۔"

"ایں! بھائی صاحب کیا بڑی بی مرگئیں؟ ہے ہے۔ بڑی اچھی تھیں۔" میری زبان سے بے اِختیار نکل گیا "توبہ" امّی نے لقمہ مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا "اچھا تم لوگوں نے مجھے پریشان کیا۔ میں سمجھی کہ اپنے عزیزوں میں سے خدانخواستہ کوئی چل بسا۔"

"امّی وہ بھی بڑی ہی نیک عورت تھیں۔ اگر آپ اُن سے ملتیں تو اپنے عزیزوں کو بھول جاتیں" بھائی صاحب نے کہا۔

مجھے بڑا صدمہ ہوا اور بھائی صاحب کو بھی۔ کھانے سے اُٹھ گئے۔ لاکھ امّی و ابا نے اِصرار کیا لیکن بھوک ہی نہیں رہی تھی۔

شام کو بھائی صاحب نے لکھنؤ جانے کے لئے بستر باندھا۔ ابا کو جب معلوم ہوا تو وہ بغرض تعزیت اُن کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئے۔ میرا سفر کے لئے اِصرار کرنا بے محل سا تھا چنانچہ چُپ ہو گئی۔ وہ تو بھائی صاحب ہی نے

پُوچھ لیا "تیری طبیعت چاہتی ہو تو تو بھی چلی چل" حالانکہ میرا مُطلق جانے کا قصد نہ تھا لیکن اُن کی اِس تحریک سے فوراً آمادہ ہوگئی۔ ابا نے کہا بھی کہ وہ جا کر کیا کریگی۔ خیر شام کو ہم سب روانہ ہوگئے اور وحید کو اپنی آمد کا تار دے دیا۔ وہ اِسٹیشن پر موجود تھا۔ نہایت تپاک سے ہم کو اُتارا اور اپنے خوش وضع مکان پر لے گیا۔

دو روز ہم یہاں رہے اِس عرصہ میں ابا اس کے مہذب اطوار اور شریفانہ طور وطریق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس سے وہ بھی بیحد محبت کرنے لگے۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد میں دوسرے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ وحید ذرا بازار گئے تھے۔ ابا اور بھائی صاحب پاس والے کمرے میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کیا باتیں تھیں۔ بس اِتنا سمجھ لیجئے کہ دونوں باپ بیٹے کی نظر میں وحید بالکل جچ گئے تھے میرے لئے اُن سے بہتر کوئی بَر اُن کو مِلنا مشکل تھا۔ اَبا چاہتے تھے کہ وحید کو امّی بھی دیکھ لیں چنانچہ اُن کا غم غلط کرنے کو اُنھوں نے وحید کو الہ آباد چلنے کی ترغیب دی جِس کے لئے وہ آمادہ ہوگئے۔

دوسرے روز ہم اِسٹیشن پر پہنچے۔ ذرا جلدی آ گئے تھے۔ مجھے زنانہ وٹینگ روم میں بٹھا دیا گیا جہاں ایک اور مغرور سی عورت پہلے سے موجود تھی جس کو بھائی صاحب وغیرہ نہیں دیکھ پائے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی آگئی۔ اور چند منٹ بعد وہ عورت اپنا بُرقع لاد کر چلدی۔ ۲ منٹ ۳ منٹ ۵ منٹ گذر گئے لیکن مجھے لینے کوئی نہ آیا۔

ابھی میں اس حالتِ انتظار میں بےچینی سے بیٹھی ہوئی تھی کہ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین روانہ ہوئی۔ میں گھبرا کر باہر نکلی اور بھاگتی ہوئی پلیٹ فارم پر پہنچی۔ مگر میرے سامنے سے تیزی سے گاڑی گذر رہی تھی نہ تو کہیں بھائی صاحب نظر آئے نہ آیا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ دوڑ کر چڑھ جاتی۔ دفعتہً آگے نکل جانے والے ایک ڈبہ میں سے کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے پکارا۔ میں کیا کر سکتی تھی گاڑی میرے سامنے سے نکل چکی تھی۔ بوکھلائی ہوئی اُس کے پیچھے دوڑی۔ ناگہاں رواں گاڑی میں سے کوئی کودا، ریل کی رفتار نے اس کو اس قدر دھکا دیا کہ وہ دور تک پلیٹ فارم پر لڑکتا چلا گیا۔ آہ! وحید تھے۔ وہ مجھے دیکھکر دوڑتی ہوئی گاڑی میں سے کود پڑے تھے۔ لوگ دوڑ پڑے اور اُن کو جا کر اُٹھایا۔ میں بھی شرم و حیا کو بالائے طاق رکھکر اس طرف بڑھی۔ وہ اب تک زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ میں اُن کے قریب پہنچی اور گھبرا کر اُن پر جھک گئی۔ اُنھوں نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھکر اُٹھ بیٹھے ”آپ کے کہیں چوٹ تو نہ آئی“ ایک ہمدرد انسان نے اُن سے دریافت کیا۔

”نہیں صرف چکر آ گیا تھا“ یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے مسکرا کر بولے ”فکر نہ کیجئے میں بفضلہ بالکل محفوظ ہوں“ اِس کے بعد وہ مجھے ویٹنگ روم میں لے گئے۔

”آپ آرام کرسی پر لیٹ جائیے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کے کوئی چوٹ نہ آئی“ میں نے آہستہ سے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ کس قدر مغالطہ ہوا ہم کو۔" اُنھوں نے ہنستے ہوئے کرسی لیکر کہا۔ "ہم سب یہ سمجھے کہ تم گاڑی میں بیٹھ چکی ہو۔ کیا تمہارے کمرے میں کوئی اور خاتون بھی تھی؟"

"جی۔ اچھا ان کو دیکھ کر آپ سمجھے کہ میں ہوں۔ مگر تاہم احتیاطاً آپکو ویٹنگ روم میں آکر دیکھنا چاہیئے تھا۔" میں نے کہا۔

"کاش مجھے یہ اختیار حاصل ہوتا۔" اُنھوں نے حسرت سے کہا۔ واقعی بھائی صاحب اور ابا کی موجودگی میں وہ کس طرح مجھے دیکھنے آتے۔

"ابا اور بھائی صاحب معلوم نہیں مجھے کہاں ملیں گے۔" میں نے پریشانی سے کہا۔

"گھبرائیے نہیں۔ آپ کی آسائش کے لئے میں بھی اپنی جان کا فرش کر دونگا۔ میرا خیال ہے وہ دوسری گاڑی سے ابھی واپس یہیں آجائیں گے۔ ابھی ڈاؤن ٹرین بھی یہاں آنیوالی ہے۔"

"آپ کو اس طرح چلتی ریل میں سے نہیں کودنا چاہیئے تھا خدانخواستہ ......" میں خاموش ہوگئی۔

"نہیں میں ریل کے نیچے نہیں آسکتا تھا۔" اُنھوں نے میرے شبہ کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

چند منٹ تک خاموش رہی۔ وہ بار بار اپنی کہنی ٹٹول رہے تھے میں نے جو رُکتے ہوئے دیکھا تو کوٹ وہاں سے پھٹ گیا تھا اور اُن کی کہنی سے

خون نکل رہا تھا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ کوئی چوٹ نہ آئی۔ یہ کیا ہے؟" میں نے بُرقعہ میں سے ہاتھ نکال کر اُن کی کہنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں خراش آگئی ہے۔ کوٹ کی آستین نے بچا لیا ورنہ زیادہ چوٹ آتی۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے سگریٹ نکالا اور منہ سے لگا لیا۔ پھر بولے "نوازش ہوگی اگر آپ ذرا اس کو دیا سلائی بتا دیں گی۔" یہ کہہ کر اُنھوں نے دیا سلائی کا بکس میری طرف بڑھا دیا۔ لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ آخر اُنھوں نے خود بدقت ایک ہاتھ سے سگریٹ جلایا۔

"خاتون تم میرے سنگار دان والے خط سے ناراض تو نہیں ہوئیں" اُنھوں نے مسکرا کر پوچھا اور اپنا ہاتھ کوٹ کے گریبان سے اُٹکا لیا۔ میں شرما کر چپ ہو گئی۔ اُنھوں نے مکرر اس سوال کو دُہرایا اور مجھے جواب کے لئے قسمیں دینے لگے۔

"وہ کیا حرکت تھی آپ کی" میں نے آخر دھیمے سے کہا۔

"بالکل جائز حرکت تھی جس کی اجازت شرع بھی دیتا ہے" وہ بولے۔

"اور کیا اس حاشیہ والے فقرے کی بھی اجازت شرع دیتا ہے؟" میں نے غصہ سے پوچھا۔

"اس کے لئے میں نادم ہوں۔ آہ ـــــــ

۵ شکوۂ غم تیرے حضور کیا
ہم نے بے شک بڑا قصور کیا"

وہ بکمال رقت بولے۔ میں چپ ہو گئی۔

"ناظرہ۔ میں بوالہوس لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ لیکن پھر بھی ہوں بشر۔ اپنے جذبات پر غالب نہ آسکا۔ نکل پڑا قلم سے وہ فقرہ اگر تم واقعی اس کی وجہ سے مجھ سے ناخوش ہو گئی ہو تو میں بمنت تم سے درخواست کرتا ہوں کہ للہ مجھے معاف کر دو۔ میں ضبط غم کرتا ہوا مر جاؤں گا لیکن آئندہ پھر کوئی ایسا فقرہ زبان سے نہ نکالوں گا" یہ کہہ کر وہ میرے پیچھے ہی پڑ گئے اور لفظ "معاف" میری زبان سے ادا کرا کے رہے۔

چند سیکنڈ تک خاموش رہی، وہ اٹھکر باہر جانے لگے کہ دفعۃً ایک درد کی سسکی کے ساتھ میز پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے جو گھبرا کر دیکھا تو کسی طرح ان کا ماؤف ہاتھ کوٹ کے گریبان سے آزاد ہو گیا تھا اور اب بری طرح جھول رہا تھا۔

"ہیں! یہ کیا!!" کہہ کر میں بے اختیار کھڑی ہو گئی اور ان کے لٹکے ہوئے ہاتھ کو جو سنبھالتی ہوں تو معلوم ہوا کہ کہنی پر سے نکلا ہوا ہے، دراصل ہاتھ تو ان کا گرتے ہی ٹوٹ گیا تھا لیکن میری پریشانی کی وجہ سے منہ سے نہ کہا۔ ضبط کئے بیٹھے رہے۔

"آپ عجیب بے پرواہ انسان ہیں۔ ٹوٹا ہوا ہاتھ لئے اس قدر اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ خدانخواستہ

غلط جڑ گیا تو مصیبت ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے با آہستگی اُن کے ماؤف ہاتھ کو سہارا دیا اپنے دونوں رومال ملا کر سلنگ بنائی اور اُن کے گلے میں ڈال کر آرام سے ہاتھ کو اُس میں ڈال دیا۔ اس کے بعد فوراً بہرے کو بلایا اور اس سے ریلوے ڈاکٹر کو طلب کیا۔

بہرا دوڑا ہوا ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

"بہت بہت شکریہ" وہ میرے قریب آکر بولے: "اچھا اب آپ اپنے حسین جسم کو تو برقع میں چھپالیں جو حضور کی سراسیمگی کی وجہ سے بندشِ پردہ سے آزاد ہو کر آسائش گیتی بڑھا رہا ہے اور چہرۂ انور کھلا رہنے دیں تاکہ اس شرعی پردہ کے روحانی اثرات سے میں حیات یاب ہوتا رہوں۔" وحید نے مسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے گھبرا کر اپنے کو برقع میں چھپالیا۔

ڈاکٹر نے آکر کھپچیاں اور پٹی باندھ دی اور جاتے ہوئے مسکرا کر اپنے مریض سے بولا: "یہ بھی اچھا ہے کہ آپ کی اہلیہ آپ کے ساتھ ہیں۔ اُن سے آرام ملتا رہے گا۔ اگر آپ تنہا ہوتے تو بڑی مشکل ہوتی۔"

"تھینک یو ڈاکٹر" وحید اس کے ریمارک پر بمشکل ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولے۔

جب وہ چلا گیا تو مجھ سے کہنے لگے: "حضور نے سنا؟ وہ مجھے کیا مژدہ سنا گیا ہے؟ اللہ اللہ——" وہ مسرت سے

تالیاں بجانے لگے اور اِس دیوانگی میں پھر ہاتھ سِلنگ میں سے
پھسل گیا۔ مجھ پر اُن کے اگلے فقرہ کی وجہ سے سخت شرم طاری تھی
لیکن اُٹھ کر پھر ہاتھ کو سنبھالا۔ ہم بالکل ایک دوسرے کے قریب
کھڑے تھے کہ اتنے میں باہر بھائی صاحب اور آپا کی آواز سنائی دی ہیں
جھٹ سے بھاگی اور دور جا بیٹھی۔ اور میرے مکار وحید بھی ایسے لیٹ
گئے گویا ٹوٹے ہوئے ہاتھ کے صدمے سے دشمن بیہوش پڑے
ہیں +

افسانہ "دو حادثوں کے درمیان" بہت اچھا افسانہ ہے۔ مجھے بہت پسند آیا

دو حادثوں کے درمیان [illegible]

کارزارِ حیات!

ایک کاروانی زندگی کے تجربات

اِس افسانہ کی بالکل اِبتدائی چند ——— اعظمی صاحب اجمیری (سابق رفیعی) نے لکھی تھیں، اس کے بعد تھک کر اس کو ڈالدیا تھا۔ دوسرے کی ناپی ہوئی زمین پر میں عمارت کھڑی کرنا پسند نہیں کرتا، لیکن اِس اَفسانہ کی زمین کچھ ایسی شگفتہ تھی جو مجھ جیسے شوریدہ سر اِنسان کے لئے بالکل موزوں تھی۔

دہلی ۱۷ ستمبر [illegible]ء

پیارے زاہد

ایک عظیم الشان شہر کا آفتاب ایک چوبیس سالہ میانہ قامت، معقول صورت

نوجوان کو طلوعِ آفتاب سے غروب تک تلاشِ معاش میں دربدر مارا مارا پھرتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ آفتاب آہستہ آہستہ اپنی مسافت طے کر کے پردۂ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ سوختہ سامان نوجوان مایوسانہ قدموں کے ساتھ لوٹ کر تھکا ہارا۔ اپنے حجرۂ تاریک میں آکر پڑ رہتا ہے۔

یہ عظیم الشان شہر دارالسلطنت دہلی ہے۔ اور وہ برگشتہ و حیران نوجوان ——— تمہارا کلیم ہے۔

صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ۔ توبہ!

میں نے تم سے چلتے وقت وعدہ کیا تھا کہ وقتاً فوقتاً تمہیں اپنے حالات سے مطلع کرتا رہونگا۔ چنانچہ میں پہلی فرصت سے فائدہ اٹھا کر تمہیں مخاطب کر رہا ہوں۔ دن بھر کی کوچہ گردی کے باعث اگرچہ تکان سے خستہ ہو رہا ہوں، لیکن دماغی حزن نے دل کی رفتار کو بے ترتیب کر دیا ہے جس کا لازمی نتیجہ بیخوابی ہے اور میں بیخوابی کے ان لمحات کو تمہیں خط لکھکر بہترین مصرف میں لا رہا ہوں!

میں نے دنیا کے دریائے بے پایان میں اپنی کشتیِ حیات کو کچھ شیریں امیدوں اور خوشگوار توقعات کے ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ یہ خراب آباد گیتی کبھی میرے لئے راحتوں اور مسرتوں کا سرچشمہ نہیں بنی۔ عشرت کے دیوتا کی تبسم آمیز عنایت مجھ پر کبھی نہیں ہوئی۔ تمہیں معلوم ہے میری زندگی کیسی دشواریوں میں بسر ہوئی ہے، کن حالات میں میں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اور کن تفکرات

کے ہجوم میں ہیں نے ایم۔اے کیا؟ ظاہر ہے کہ مجھ جیسے خوگرِ آلام کا دل ناکامیوں سے ٹوٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ میری زندگی کی ساری تعمیر ہی ناکامیوں پر ہے۔ اِس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں قنوطی ہوں۔ نہیں برخلاف اِس کے مجھ میں رجائیت کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ناکامی صرف اسی وقت زیادہ جانکاہ ہوتی ہے جبکہ ہم خواہ مخواہ غیر مدلل طفلانہ توقعات قائم کر لیتے ہیں اور یہ کہ جب تن "ہمہ داغ داغ" ہو تو نہ مرہم کی گنجائش ہوتی ہے نہ اُن داغوں میں کسی جدید داغ کا اضافہ کوئی نمایاں احساس پیدا کر سکتا ہے۔ غالب کا کثیر الذکر شعر ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

اِس جذبہ کی ایک غیر مکمل تشریح کرتا ہے جس کی اگر مزید وضاحت چاہتے ہو تو اِس شعر میں تلاش کر لو ؎

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ہم لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلم ہوئے!

یہ تھا وہ خط جو مجھے اپنے مدت سے بچھڑے ہوئے ناکام و نامراد دوست نے روانہ کیا تھا۔

کلیم شروع ہی سے ہونہار تھا۔ لیکن تھا بد قسمت۔ ہمیشہ سے بد نصیب! مقدر کا آہنی پنجہ، تقدیر کی فولادی گرفت!! خدایا کیا فی الحقیقت کسی ایسی تباہ کن قوت کا دنیا میں وجود ہے؟ کیا دراصل کارزارِ زندگی میں فتح و شکست نصیب ہے؟

I read this novel very interest

موقوف ہے؟ میدان جنگ میں تو ہم قوی دل، زورآور بازو اور عمدہ اسلاح سے شکست کو زیر کر سکتے ہیں پھر کیا اس جیون کی جنگ میں ہم زیرک دماغ اور غیر متزلزل صحت کی مدد سے جیت حاصل نہیں کر سکتے؟ کر سکتے ہیں بشرطیکہ "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہو گئیں" کے بعد بھی ہم "احساس آسانی" کے لئے زندہ رہ سکیں۔

کلیم نے بارہ سالہ تعلیمی مدت کسی موہوم مستقبل اور آئندہ کے خوشگوار سراب میں پھنس کر ختم کر دی تھی، اس کا خیال تھا کہ کوئی معقول ملازمت نہ ملی تو گئی گذری کلرکی تو کہیں نہیں گئی۔ لیکن اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا کسی دفتر میں کلرک ہونا بھی اسی قدر دشوار ہے جس قدر دہلی کا بادشاہ بننا۔ زمانۂ شباب میں عین زمانۂ شباب میں اس سے محبت کی پری بھی روٹھ گئی۔ ہاں یاسی کی ڈائینوں اور بدنصیبی کی چڑیلوں سے آج کل اس کی روز ملاقات ہوا کرتی تھی۔

استغفر اللہ! یہ میں کیا غیر متعلق باتیں کہنے بیٹھ گیا مجھے تو ابھی آپ کے سامنے کلیم کی پوری ڈائری پیش کرنی ہے۔ ڈائری؟ ڈائری نہیں اس کی پامال آلام، وقف صعوبت، شکار تعب حیات، اس کی صدموں اور ناکامیوں سے بھری ہوئی داستان جو اس نے وقتاً فوقتاً خطوط کی شکل میں مجھے سنائی تھی۔

"زاہد! غالب بھی معلوم ہوتا ہے اسی قسم کے الم زا واقعات زندگی کا شکار تھا جس قسم کے تاریک سانحاتِ حیات میں رکھتا ہوں؟"

کلیم کے ایک طویل خط کی عبارت تھی" ورنہ اس کا وفورِ مایوسی میں پکار اٹھنا "یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے" اس کا نوا فتادگی سے — "سر زیربار منّتِ درباں کئے" ہی غنیمت سمجھنا۔ اس کا انتہائی یاس سے "جانتے ہیں سینہ پرخون کو زنداں خانہ ہم" کی صدا لگانا اور آخر میں جب شدائد زندگی سے بس نہ چلا تو "نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی" کہکر تسکین کاذب حاصل کرنے کی سعی لاطائل کیا معنی رکھتی ہے؟ عزیز دوست اگر دنیا میں مقدر کا کوئی وجود ہے تو میں بہت سُرعت کے ساتھ اس کی جانب چلا جا رہا ہوں۔ میں بہت تیزی سے اس سرحد میں داخل ہو رہا ہوں جہاں قضا و قدر انسان کو کشاں کشاں لے جایا کرتے ہیں۔ اس خیال سے زاہد ایک طمانیت خام تو حاصل ہوتی ہے کہ میں برگشتۂ تقدیر اپنے مقدر کی وجہ سے پامال و نامراد ہوں۔ لیکن اپنے اس تعقل آب دماغ کا کیا کروں جو سطحیات کے پوشیدہ پردوں میں مجھے اُلجھا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ جو مجھے ہمیشہ بلند خیالی، تعمق نظری اور ژرف نگاہی کی پریشان کن رفعتوں میں لئے پھرتا ہے۔ آہ میں سوچتے سوچتے تھک گیا، میرے قویٰ مضمحل ہو گئے۔ میرا ہر عضو ضعیف ہوتا جا رہا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دماغ ہاں صرف دماغ میں تمام اعضا کی روح کھنچ کر آ گئی ہے۔ کیونکہ اس میں مجھے مطلق ضعف محسوس نہیں ہوتا۔ وہ رات دن کے ۲۴ گھنٹوں تک خون کا ایک متلاطم چشمہ خیالات کا ایک متموج دریا بنا رہتا ہے۔ اس قدر پست حالت میں یہ خودستائی زاہد کچھ زیب

نہیں دیتی ہے۔ لیکن خودستائی اگر جائز طور پر کی جائے تو اکثر بلندی کی طرف انسان کو لے جاتی ہے ۔۔۔۔ مگر بلندی اور میرے لئے؟ میں تو آجکل بہت پست ہو رہا ہوں اور جب سے مجھے اپنی پستی کا احساس بھی ہونے لگا ہے اُس وقت سے میں آئندہ بلندی کی جانب سے بھی مایوس سا ہو چلا ہوں۔

زاہد! اِس طلسم کو کیوں نہیں توڑ پھینکتے۔ حیران ہو کر میرے ہزیانی نعروں کو نہ پڑھو۔ ہاں توڑ ڈالو اس طلسم کو، طلسم مقدر کو، تقدیر، عزیز دوست، اگر فی الحقیقت کوئی چیز ہوتی تو وہ میرے آہنیں ارادوں، میرے خاراصفت منصوبوں اور میری فولاد آسا قوتِ ارادی کے مقابلہ میں اب تک پانی کی طرح بہ گئی ہوتی۔ تقدیر — تقدیر — کسقدر لغو ڈھکوسلا ہے۔ یہ تقدیر نہیں ہے۔ یہ مقسوم نہیں ہے جو اِس ہنگامۂ حیات میں ہم کو فتح و شکست سے دوچار کرتا ہے۔ یہ غیر مساعد اسباب کے اثرات ہیں جو انسان کو ناکام و نامراد بناتے ہیں۔ اِس عالمِ اسباب میں ہم کو جہد للبقاء کے اٹل قانون کے زیر اثر دوسرے انسانوں کے اسباب کو شکست دیکر اپنی زندگی کے اسباب کو ہلکا اور مساعد بنانا پڑتا ہے۔ اور اس کشمکش میں زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قرن گزر جاتے ہیں۔ اسباب کی تسخیر کو کچھ آسان کام سمجھتے ہو تم؟ تقدیر کیا بلا ہے کشمکش کرو اسبابی اور نام رکھو اس کا تقدیر! یہ زبان کا سقم اور مفہوم کا تناقص ہے۔ تم میری نامرادیوں کی داستان کو شاید مومنانہ عقائد سے پڑھ رہے ہو خیر پڑھو جس طرح تمہارا جی چاہے۔ لیکن میری ناکام حکایتِ محبت کے لئے اگر تم نے لفظ

" تعذیر" استعمال کیا تو میں خودکشی کر لونگا۔ نجمہ کو جس طرح چچی نے پالا تھا وہ تو تم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ننھے سے دل والی دوشیزہ۔ وہ میری خوش رنگ قمری! آہ نجمہ کیا تو نے بھی مجھے دعوتِ محبت اِسی لئے دی تھی کہ میں محبت کے باب میں بھی نامراد ہو جاؤں! اللہ!!

میں نے شروع میں ایکبار بھی اِس داعیٔ محبت حسینہ کی جانب پیار کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کی وجہ چچی کے عتاب کا خوف تھا، بلکہ میں قصداً اس لڑکی کو کچل رہا تھا۔ دبا رہا تھا۔ ستا رہا تھا۔ تاکہ وہ جان لیوا محبت کے عزرائیلی پھندے میں سے کبھی نکل ہی نہ سکے۔ تاکہ دستِ قدرت بھی اس کی مدد کرنے سے انکار کر دے، فطرت بھی اس کے اندر سے " رجعت" کی طاقت کو سلب کرلے۔ وہ آ رہی تھی، چلی آ رہی تھی، آہستہ آہستہ خس پوش راہ کی طرف جو میں نے اُس کو پھانسنے کے لئے تیار کی تھی۔ آہ لیکن چاہ کن را چاہ درپیش۔ اس کی وضاحت میں آگے کرونگا۔ خیر تو وہ میری کچھ اس قدر گرویدہ ہو گئی تھی کہ مجھ بن اس کو ایک لمحہ چین نہ آتا تھا۔

میرے تمام کپڑے اُس نے اپنے قیمتی عطر سے بسا دیئے تھے مجھے مُعطر اشیاء سے شروع سے زیادہ رغبت نہیں۔ لیکن اس نے جب محبت کی یہ زبان اختیار کی تو مجھے بھی چُپ ہو جانا پڑا۔ اُفوہ! کس قدر نفاست پسند لڑکی تھی۔ میں بھونچال کی طرح اپنے کمرے میں گھس کر تمام اشیاء کو تتر بتر کرتا ہوا باہر سیر کو چلا جاتا

اور جب واپس آتا تو ہر شئے اس خوبصورتی سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی نظر آتی جیسے خوبصورت چہرے پر حسین آنکھیں! وہ میرے جھوٹے پانی پر مرتی تھی۔ میں توہمات پرست انسان سمجھا کہ وہ اس طرح میری عمر کوتاہ کر کے اپنی زندگی دراز کرنا چاہتی ہے، چنانچہ اس سے پانی نہیں منگواتا۔ میری اس حرکت سے اس کو صدمہ ہوتا وہ پانی پینا قطعی ترک کر دیتی۔ اور یہ روزہ مجھے مجبوراً اپنے جھوٹے پانی سے تڑوانا پڑتا۔ آہ زاہد! میں کہاں تک اس کی سپردگی کی داستان سناؤں۔ ایسی فدا محبت لڑکی، ایسی وفا شعار حسینہ، ایسی جذبات نواز دوشیزہ اُف! مجھ سے چھن گئی۔ مجھ سے چھین لی گئی! کیا تقدیر نے چھینی؟ نہیں مجھ سے قوی تر اسباب والے انسان نے۔ آج یہ واقعہ بقدر چھ سال اپنی عمر ختم کر چکا ہے۔ اور پیاری نجمہ بھی حوروں کے غول میں ملکر مجھے فراموش کر چکی ہوگی (اس کا انتقال ہوگیا) لیکن پامال اسباب۔ کلیم آج بھی دندناتا پھر رہا ہے۔ دہلی کے گلی کوچے اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ وہ تھک کر پٹڑی پر سڑک کے کنارے ذرا دم لینے بیٹھ جاتا۔ اور جب اس کی جیب میں کچھ پیسے ہوتے ہیں تو کسی اچھے ہوٹل میں مزے سے ٹفن بھی اُڑاتا ہے۔ چاوڑی کی معصوم فضا اس کی قوتِ بہیمیہ کو (جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے) تسکین کی دعوت دیتی ہے۔ لیکن وہ خدا کے ڈر سے نہیں بلکہ بندوں کے ڈر کے مارے اُدھر جانے کی جرات نہیں کرتا۔"

اِس کے بعد اس کا دوسرا خط تھا:۔

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ رنج و تعب میں احساس رنج "مرکے مارے شاہ مدار" کے مصداق ہے۔ حساس لوگ اس وجہ سے پامال الم ہو کر جلد اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔ میری حساسیت سے تم خوب واقف ہو لیکن تم غالباً میرے اس ارتقاء پر اظہار حیرت کروگے کہ پیہم ناکامیوں کے باوجود میرا رومال میری اشک شوئی کی ذلیل خدمت سے اب تک محفوظ ہے۔ رنج کا احساس کرتا ضرور ہوں لیکن اس کے تعلق کو زیادہ برقرار نہیں رہنے دیتا۔ میں اپنے اندر ایسی قوت بھی پیدا کر رہا ہوں جس سے اس کمزوری پر بھی غالب آسکوں۔ اور میرے اعصاب، میری عروق، میرے دل و دماغ لفظ رنج و محن سے اسیقدر نا آشنا ہو جائیں جس قدر ایقان کفر سے نابلد ہے۔ لیکن دشواری ایک یہ ہے کہ وہ قوی ترین حس، وہ غضبناک خواہش جس کے لئے کسی نے لفظ "شہوت" وضع کرکے اپنی بہت ہی کم علمی و کم دانی کا ثبوت دیا ہے اپنی تباہ سامانی میں، اپنی سیاہ کارانہ ترغیبات میں، اپنی ابلیسانہ تحریص میں اسی قدر تُند ہے جس قدر ایک مردِ مجرد کے اندر اس کو ہونا چاہیئے۔ پھر اس کی سکون گیری کے ذرائع میرے لئے اِس قدر سہل الحصول ہیں کہ ایک چڑیا کو پکڑنے کے لئے تو دام درکار ہے اور یہاں "بے دام" (باعتبار ہر دو معنی) کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن اگر حضرت حنظلہؓ اعلانِ جہاد سنکر شبِ زفاف کے لطیف لُطف کو

ٹھکرا سکتے ہیں تو میں بھی "فراوانی شکار" اور امکانِ معصیت کے باوجود اس مزیدا مزے کی جانب سے منہ موڑے ہوئے ہوں۔ داد دینے کی چنداں ضرورت نہیں میں تمام انسانی اسفل حیات کو مسخر کر رہا ہوں۔ چند روز بعد تم شاید سن سکو گے کہ کلیم مافوق الانسان بن گیا۔ عزیز دوست! یہیں جوگ، نفس کشی، تصوف وغیرہ کے ڈانڈے آکر مل جاتے ہیں۔ مگر تصوف اور جوگ انسان کو معطل کر دیتے ہیں (یا انسان کے علاوہ اس کو کچھ اور بنا دیتے ہیں) اور میرا طریق عمل مجھے باکار و فیض رساں ہستی بنا دے گا۔

معاف کرنا میں نے بڑی خشک بحث کا آغاز کر دیا۔ شہوانی باتیں کرتا کرتا ادھر لڑھک گیا۔ لو ایک اور ہمارے غیر مساعد معاشقہ کی حکایت رنگیں سنو۔ یہ تو تم سب سے پہلے سمجھ لو کہ میں اس میں بھی ناکام ہی رہا کیونکہ ناکامی نامرادی وغیرہ سب میرے حصہ میں آئی ہوئی تھیں۔ میں نے بھی، لیکن ان کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ یاد ہی کرینگی۔ کچھ عرصہ تک تو وہ فرعون صفت ملکہ کی طرح مجھے ستاتی رہیں۔ مجھے خوب پامال کیا مگر میں بھی ان سے کنیزی کا دم بھرا کر ہی رہا۔ ہاں تو میں تم کو اپنے معاشقہ کی داستان سنا رہا تھا۔ اچھا سنو۔ میں شہر کا نام نہیں بتاؤنگا بہر نوع وہ ایسی بستی تھی جو ایک جویائے معاشقہ کے لئے زیادہ پر لطف مواقع فراہم کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ایک کارخانہ میں عارضی جگہ مل گئی تھی۔ بھائی سرکیوں دھنتے ہو۔ ایم۔ اے کر کے اگر کارخانہ میں نوکری کی تو

کیا غضب ہو گیا۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ کارخانہ میں نوکری نہیں کرتا تو کیا کرتا۔ دفتر کی کلرکی سے تو مایوس ہو ہی چکا تھا۔ ابھی ابھی آپ اور زیادہ تاسف کرینگے بندے کو نوکری بھی ملی تو بغیر تنخواہ کے۔ آیا آپ کے خیال شریف میں؟ ایں جناب بغیر تنخواہ کے نوکر تھے جناب!

مالک کارخانہ کی دو حسین و نوجوان لڑکیاں تھیں۔ اور اُن مدت سے گرفتار قفس طوطیوں نے ابھی آزادی حاصل ہی کی تھی: بہر نوع ہنوز اُن کو شعور پرواز بھی نہ تھا۔ کارخانہ کے نوجوان منیجر صاحب جنھوں نے

"کتب خانۂ چند کالج بشست"

کی ذرا بھی زحمت نہ فرمائی تھی، بڑے زور سے بڑی لڑکی پر مٹے ہوئے تھے۔ تنخواہ دو سو روپے ماہوار ملتی تھی۔ تعلیم بالکل پست تھی۔ ذاتی اصول کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ہر پڑھے لکھے انسان کے سامنے مرعوب ہو جاتے تھے۔ اوباشوں کی صحبت تھی (جو کمی تعلیم کا لازمی نتیجہ تھی) ان باتوں سے تم اس شخص کے کردار و سیرت کا خود اندازہ لگا لو۔ شہوانی جذبات کا جہانتک تعلق ہے تمام بنی نوع اس میں مشترک ہیں، لیکن اس کے طریقۂ استعمال میں مشترک نہیں۔ ایک، اس بہیمیت کو بہیمیت کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ایک بہیمیت پر بھی انسانیت کو غالب رکھتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ منیجر صاحب خالی از حسن اطوار مگر پُر زر کیسہ لئے اس حسینہ پر مفتون تھے۔ اور اس کے نسوانی رجحانات (اپنے

نسوانی الطاف قصداً نہیں کہا ہے) حاصل کرنے میں کسیقدر کامیاب ہو گئے تھے۔

زاہد مجھے یہاں دو بول نصیحت کے بلکہ اصلاحی کہہ لینے دو۔ میں کوئی مُصلح نہیں ہوں لیکن ہماری سوشیل کمزوریوں سے ایک نوع کا نتیجہ ضرور نکال لیا کرتا ہوں۔ خیر تو گذارش یہ ہے کہ بے پردہ خواتین لذّتِ بے پردگی سے کچھ اس قدر مغلوب ہو جاتی ہیں کہ وہ ہر خوشگوار واقعے سے (جس کے پیٹ میں خواہ خار بھرے ہوئے ہوں) لطف لینے کی کوشش کرنے لگتی ہیں۔ انجام بینی کا مادہ چونکہ فطرتاً کم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک لغزش معصوم۔ ایک بیقاعدہ اِقدام (جس سے بچنا ناگزیر ہوتا ہے) اُن کی زندگی اور اُن سے متعلق زندگی کو تباہ کر دیتا ہے۔ یورپ میں بھی عورتیں مردوں کے کردار پڑھنے میں غلطی کر جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ بہت جلد بشکل طلاق نکل آتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی زندگی کے عمیق مقاصد کو سمجھنے کی کسیقدر صلاحیت رکھتی ہیں اور اپنا کچھ نہ کچھ باقاعدہ اصُول حیات بھی رکھتی ہیں (خواہ وہ طلب تعیش ہی ہو) گر ہندوستانی خواتین جو کوئی باقاعدہ اُصول زندگی نہیں رکھتیں اور جن پر محض جذبۂ تقلید کا تسلط ہوتا ہے بہت زیادہ نقصان اٹھا جاتی ہیں۔ "آرزوئے تبدیلی" کے دو نتیجہ ہیں" اچھے اور بُرے۔ اور بُرا نتیجہ زیادہ ممکن ہے جس کی وجہ میں ابھی ظاہر کر چکا ہوں۔ عام شاعرِ احساسات میں تمام انسان برابر ہیں، لیکن قومی تاثرات میں اختلاف ہے۔ فرانسیسی زیادہ حساس ہوتے ہیں اور ر

انگریز کم۔ اِسی طرح ہندوستانی عورت درد آشنا زیادہ ہوتی ہے اور حقائق آشنا کم۔ پھر چونکہ اثر گیری میں اپنی ایک نمایاں شان رکھتی ہے۔ ہر شئے سر سے راہے اُس پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور وہ سب کا اَثر قبول کر کے ایسی بن جاتی ہے جیسی بچوں کے حساب کی کاپی جس پر بیک وقت سوالات بھی درج ہوتے ہیں، ہندسے بھی ہوتے ہیں۔ الف۔ ب۔ ت بھی ہوتی ہے اور عجیب وغریب شکلیں بھی۔ ہندوستانی عورتوں کو بے پردگی کی تعلیم دینے کے حامی حضرات کو لازم ہے کہ پہلے وہ اُن کے اندر حقیقی نسائیت کو جگائیں۔ ان کو صحیح معنی میں عورت بننا سکھائیں اُن کو پہلے وہ باتیں بتائیں جو "لوازمات نسائیت" میں سے ہیں ورنہ وہ ایک غیر مکمل رقاصہ، ایک ناقص مغنیہ اور ایک آوارہ بے پردہ عورت کے سوا کچھ نہ بن سکیگی۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ یوریپین عورت نے موجودہ تعیشات کتنے عرصہ کے بعد اختیار کیئے ہیں۔ اور اِس سے قبل اپنی شخصیت زندہ رکھنے کے لیئے وہ کن کن نسوانی ضروریات میں درک تامہ حاصل کرنے کی سعی کرتی رہی ہے۔ جب وہ کامیاب ماں (جیسی کہ وہ دنیا میں مشہور ہے) ایک صلح کار مشیر اور اتالیق اطفال ہستی بننا سیکھ چکی تو اس نے اِن تعیشات (رقص وسرود) کی جانب توجہ کی (چونکہ رقص وسرود زیادہ لذت بخش (منفعت بخش نہیں) اور کم تکدر انگیز ہے اس نے اپنی زندگی کے اہم مقاصد کو فراموش کر کے اپنے کو عیش

ہی کا دلدادہ بنالیا) لیکن اگر اب بھی ضرورت پڑے تو وہ اپنے کو قابل ماں (شاید اچھی بیوی تو نہیں) ثابت کرسکتی ہے۔ اب دیکھئے ہندوستانی خواتین کو وہ ایک دم بغیر تکمیلِ نسائیت کے اُن مدارج تک پہنچ جانا چاہتی ہیں، جن تک پہنچنے میں یورپ کی عورت نے تقریباً ایک صدی تک کشمکش جاری رکھی تھی۔ آپ خود سوچ لیجئے کہ اس سعی بے محل کا کیا نتیجہ ہوگا۔ وہ وہی غیر مکمل رقاصہ، ناقص مغنیہ اور بے پردہ آوارہ عورت بنی رہ جائیگی۔

خیر تو اس سمع خراشی کا مقصد یہ تھا کہ نازو (مالک کارخانہ کی صاحبزادی) منیجر صاحب کی کم علمی ان کے پست کردار، ان کے رکیک خیالات اور اُن کی بے اصولی زندگی کو اپنی غیر مکمل نسائیت کی وجہ سے نہ سمجھ سکی۔ کرنے لگی ان کی جانب التفات (اگرچہ خفیف ہی سہی)۔ یاد رکھو کہ ایک بُرا مرد پھر عورت کو خوش کرسکتا ہے لیکن ایک بُری عورت مرد کو بالکل خوش نہیں کرسکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی عورت جب اپنے کو مرد کے سپرد کرتی ہے تو مع اپنی تمام ذات کے سپرد کرتی۔ مرد اپنی ذات کا کچھ حصہ محفوظ رکھکر اپنے کو عورت کے آغوشِ محبت میں دیتا ہے۔ چنانچہ منیجر صاحب نے اپنی بُرائیاں چھپا کر نازو کے سامنے اپنی ذات ایسی قابل محبت بنا کر پیش کی تھی کہ وہ ان کو قابل التفات سمجھنے لگی۔ قدرت نے عورت کی مذکورۂ بالا کمزوری کی حفاظت کے لئے اس کو ایک اور آلہ بخشدیا ہے۔ وہ یہ کہ وہ مرد سے ہوکر

ـــــــ ذرا سوچ کر محبت کرتی ہے۔ اور جب سوچنے کے بعد محبت کرتی ہے تو وہ لازوال ہوتی ہے۔ بنیجر صاحب نازو سے مردانہ سرگرمی کے ساتھ (جیسی کہ مرد کی عادت ہے وہ بہت جلد مائل بہ محبت ہو جاتا ہے) محبت کر رہے تھے اور نازو اپنے نسوانی بچار سے ان کی محبت کو جانچ رہی تھی (جس کو میں نے غلطی سے التفات سے تعبیر کیا ہے) یہ تھے اِن دونوں کے تعلقات جب میں کارخانہ میں داخل ہوا تھا۔

تم کو معلوم ہے زاہد! کہ میں نے صناعِ حقیقی کے ہاتھوں بنائے جانے میں عام لوگوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ وقت لیا ہے۔ اس کے تم بارہا معترف رہ چکے ہو۔ نگاہیں خواہ نسوانی ہوں خواہ مردانہ مجھ تک پہنچتی ضرور ہیں اور بالخصوص نسوانی آنکھیں تو میری دور تک متعاقب رہتی ہیں۔ چنانچہ نازو کی حسین آنکھیں بھی کئی دن سے میرا برابر تعاقب کیا کرتی تھیں جن کی سامری قوت نے مجھے چند بار لڑکھڑا دیا تھا۔ چند روز بعد اس کی دلکش آنکھوں میں تبسمِ شیریں ایک "حسین راز کی شکل میں مجھے نظر آنے لگا تھا۔ ایسا "راز" جس کو اگر نازو اپنے کسی مجبوبانہ طور سے افشاء کرنے کی کوشش کرتی تو "تسلیمی کیفیات" اس کا حل ہوتا، اور اگر میں اس "راز" کو کسی خوابِ سبک میں تبدیل کر دینے پر قادر ہوتا تو اس کی تعبیر شاید ــــــ شاید محبت ہوتی۔ تم متحیرانہ ہو۔ میرے رفیق۔ ہاں میں نے اس لڑکی کو از خود

چاہنا شروع کر دیا تھا۔ میں اُس کو اُس وقت سے دل دے چکا تھا جب اُس نے ایک نگاہِ غلط انداز بھی مجھ پر نہ ڈالی تھی!۔

پریم یا محبت کی مشکلوں کو نہ آنسو دھو سکتے ہیں نہ آہیں اُن کو جلا سکتی ہیں۔ میں اشک و آہ سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی امکانی کوشش کرتا رہتا تھا اور نازو کے "نگاہی پیام" کو ایک خود ساختہ بے حسی کے ساتھ اپنی آنکھوں کی پیالیوں میں جمع کر لیتا تھا۔ اِس کے بعد آنکھوں ہی کی راہ سے اس کو پی جاتا تھا۔ لیکن اس پر ہمیشہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا کہ اس پریم رس کو میں نے پھینک دیا ہے۔

محبت اپنی معصوم معنی کے ساتھ نجمہ اپنے ہمراہ قبر میں لے گئی تھی۔ چنانچہ اَب میں جس قسم کی محبت کا بالعد فریب کھا رہا تھا وہ بالکل دنیاوی اور مادی قسم کی تھی۔ وہ محبت جو شاعر کے دماغ سے جست لگا کر ایک الھڑ فلسفی کے دماغ میں جا پہنچی ہو۔ نازو بصد ناز و حسن مع اپنی زیبائی و رعنائی کے ایک لذیذ خیال کی قیمت میں گراں نہ تھی۔ رہا تقدس تو اپنے عنفوانِ شباب میں ہم بھی ایسی مقدس محبت کے بہت خواب دیکھ چکے تھے۔ اَب تو ایک بیوی کی ضرورت تھی اور بیوی بھی دولتمند! اگر بغیر اس شرعی ہیکل کے بھی یہ عشق رسوا کار کسی حسین کافرہ کو میرے آغوش اِشتیاق میں پہنچانے کا وعدہ کر سکتا تو مجھے اِحتراماً اس کے وعدہ کا پاس کرنے میں دریغ نہیں

ہو سکتا تھا۔

نازو کچھ عرصہ بعد معذور انتخاب ہندوستانی عورت کی طرح اِس کشمکش میں پڑ گئی کہ پوزیشن اور شخصیت حسنِ مردانہ پر مترجح ہے یا مؤخر اوّل الذکر پر۔ اس کے سامنے مینیجر صاحب کی بنی بنائی پوزیشن موجود تھی اس کے ساتھ مردانہ معائب کی بہت کچھ کمی کے ساتھ ان کا نازو کے ساتھ طرزِ عمل بھی موئد تھا کہ وہ کچھ برے آدمی نہیں ہیں۔ اِدھر ہم تنہا اپنے حسن صورت کے ساتھ نازو کا جگر اور دل تھامے نسوانی فیصلہ کی دُنیا میں معلق جھول رہے تھے۔ عادات جہاں تک معرضِ بحث میں آ سکتی ہیں میں نے اُن کا مظاہرہ نازو کے سامنے کچھ اچھا نہیں کیا تھا لیکن اُس کے باوجود اس کی پر اشتیاق نگاہیں میرے فراخ سینہ، میرے وجیہ چہرے اور میرے بلند و بالا قد کی اِس طرح سیاحت کیا کرتی تھیں گویا وہ نازو کو بسانے کے لئے کسی آرام دہ اور مناسب ترین کنارِ الفت کو میرے حصۂ جسم میں منتخب کر چکی تھیں۔ ہوس ——— اُف! ہوس کاری کا ہوس کاری سے مقابلہ تھا! ہاں زاہد! جن آنکھوں میں پہلے میں مقدس محبت کی تجلیات کا اندازہ لگایا کرتا تھا وہ دراصل بوالہوسی کی تندرستی کا خمار تھا!! لیکن خدا شاہد ہے۔ میں نے اس کی اِن حریص نگاہوں سے ڈر کر ہمیشہ عالمِ ارواح کی پاک ترین روح سے پناہ مانگی۔ بجائے اِس کے کہ میرا دل اس کی اِن شہوانی نگاہوں سے گدگدا اٹھتا میں لرز جاتا تھا ایسی عورت کا دوسرا نام ناگن ہے۔ غیر مکمل بے پردہ عورت جب معاشقہ کا اقدام کرے گی تو اِسی قسم کی حرکت اس سے سرزد ہوگی۔ یورپ میں تو یہ غلطی معیوب

ہی نہیں ہے۔ اِس لئے اُس کا ذکر فضول ہے۔

"آپ کو کیا تنخواہ مِلتی ہے؟ نازو نے ایک روز دریافت کیا۔ میں متواتر دو گھنٹے کام کر کے پسینہ سکھا رہا تھا۔ نازو کے والد بھی اُس کے ہمراہ تھے لفظ تنخواہ پر وہ چونک پڑے، اور پہلی دفعہ غریب مزدوروں کی حالت سے بے خبر، اِس فرعون اِنسان کی آنکھوں میں مَیں نے رحم کی موج خفیف دیکھی "تنخواہ اُن کو مِلتی ہی کہاں ہے؟" "یہ تو تین ماہ سے بغیر تنخواہ کے کام کر رہے ہیں" نازو کے دولتمند باپ نے میری جانب دیکھکر کہا "اچھا کل سے تمہارے آٹھ آنے روزانہ مقرر کئے" مالک کارخانہ نے اپنے رحیمانہ فیصلہ پر خود بھی ناز کرتے ہوئے کہا۔ میں جھک کر آداب بجالایا۔ نازو کی آنکھیں پہلے تو مجھے (میری مفلسی معلوم کر کے) حقارت سے دیکھنے لگیں، اِس کے بعد اُن میں سے وہی افعی کا سا زہر لیکن زہر شیریں نمودار ہونے لگا "یہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہمارے تمام کارخانہ میں سب سے زیادہ خواندہ" مالک کارخانہ چلتے وقت اپنی بیٹی سے کہتے جا رہے تھے۔ نازو نے ایکبار پھر کِسی حیلہ سے پیچھے رُک کر دیکھا، اس بازنگاہی کو میں نے بعادتِ اِستغنا اپنی سیٹی کی لَے میں گم کر دیا۔

"آپ خوب انگریزی پڑھے ہوئے ہیں۔ ہمیں بھی سبق پڑھا دیا کیجئے نا۔ ایک روز نازو کی یہ مختصر تحریر مجھے مِلی۔ میں نے رقعہ کی پشت پر صرف "مشکل ہے" لکھکر حامل رقعہ کے ہاتھ واپس روانہ کر دیا۔ اِس کے بعد تقریباً ایک ماہ تک کے لئے میں اس کی رسیلی آنکھوں کے رسیلے

پیایات سے محروم رہا۔ لیکن چند روز بعد اِتفاق کی بعید از فہم طاقت نے پھر ایکبار اِس محرومی کو دور کر دیا۔

واقعہ یہ ہوا کہ ہیڈ کلرک اور منیجر صاحب کسی انگریزی مسودہ کے لئے کئی روز سے پیچ رہے تھے۔ لیکن ڈھب کا مضمون نہیں بن رہا تھا۔ آخر نازو کی یاد دہانی پر ہماری آفس میں طلبی ہوئی۔ ہم اپنے اعصاب اماس و حوصلہ شکن کام سے لگے ہوئے تھے۔ اور پسینہ میں شرابور ہو رہے تھے۔ چنانچہ اِسی حالت میں اپنے کثیف کپڑے اور غلیظ پیر لئے کر دفتر میں گھس پڑے۔

"پیر صاف کر لو ذرا" منیجر صاحب نے چوکھٹ پر ہی ٹوکدیا۔

"غلط بات ہے۔ بلایا کیوں تھا" ہم نے ذرا ناز سے کہا۔ جانتے تھے کہ اس وقت اِن لوگوں کو ہماری شدید ضرورت ہے چنانچہ کر لو نخرے جس قدر بھی کئے جائیں۔

"آجانے دو۔ آجانے دو۔ ہاں ہاں اِن کو آجانے دو" باپ اور بیٹی نے اپنی بھاری اور سُریلی آواز میں کہا۔

میں مالک کارخانہ کے داہنی طرف جا کھڑا ہوا۔ نازو اِن کی کرسی کی پشت تھامے خواہ مخواہ کاغذ پر جھکی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا چنانچہ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

تم نے زبسکو اور گاما کی کشتی دیکھی تھی؟ بس میں بھی اُس وقت کرسی پر گاما بنا ہوا بیٹھا تھا۔ میرا گریبان کھلا ہوا تھا جس میں سے میرے پُر گوشت اور فراخ سینے کی سفید جلد جس پر پسینہ اور جسم کے اندر کے چند چکنے عضلات نے

ایک چمکیلا پالش کر دیا تھا صاف نظر آ رہی تھی۔ ہاتھ باہوں تک گرد آلودہ تھے۔ جن میں سخت کام نے چند بڑی بڑی خراشیں پیدا کر دی تھیں۔ جن کی تو اضع مرہم کے عوض خاک اور مٹی سے کر لی گئی تھی۔

بجلی کا پنکھا۔ جب میرا پسینہ خشک کر چکا تو میں نے اپنی بوسیدہ آستین سے پیشانی پر سے میل کی تہہ کو صاف کیا۔ اور ہتھیلیوں پر سے بھی میل کی تہیاں اتارنے لگا۔ ہیڈ کلرک اپنے فرض میں قاصر رہنے کے باعث اور منیجر صاحب اپنے رازِ کم علمی کے افشاء ہو جانے کے سبب سے خفت آگیں توجہ سے جھوٹ موٹ ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگتے تھے اور پھر یہ فریب دینے کو لکھی ہوئی سطور کو کاٹ دیتے تھے گویا پہلے سے بہتر عبارت اُن کے دماغ میں آ رہی ہے۔ نازو کی نگاہیں مسلسل میری جانب تھیں۔ وہ میرے بازو کی اُبھری ہوئی مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ میری قوی ہتھیلیوں کی باہمی رگڑ کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں میری بلند و کشادہ پیشانی کی جانب تھیں جس پر اب تک میل کا قشقہ لگا ہوا تھا۔

"منیجر صاحب اُن کو پورا فائل دے دیجئے"، مالکِ کارخانہ نے ۳ – ۴ منٹ بعد کہا۔

منیجر صاحب نے بہت اچھا کہہ کر کاغذوں کا پلندہ میرے آگے رکھ دیا اور اس کو ٹیڑھی گردن کر کے اس انہماک سے دیکھنے لگے گویا اب وہ پورا مسودہ لکھ لینے کی اپنے میں قابلیت پا رہے تھے۔ کاغذات چند فرموں سے متعلق تھے جن سے لین دین، حساب کتاب وغیرہ کا کچھ جھگڑا تھا۔ لیکن ایک عرصے

منزلیں

جواب طلب امور کا جواب نہ پہنچنے سے معاملات الجھ گئے تھے۔

میں نے آدھ گھنٹہ میں تمام کاغذات کا مطالعہ کرلیا۔ نوٹ لئے۔ مگر جس کاغذ کو ہاتھ لگاتا داغ دار ہو جاتا تھا۔ مالک کارخانہ بہت دیر سے اپنے اس نقصان کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن کچھ ایسے مرغوب مروت ہو رہے تھے کہ منہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔ آخر میں نے اُٹھ کر ہاتھ دھوئے اور ٹائپ رائٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی کھٹا پٹ کھٹا پٹ کے بعد چار صفحات کا ایک مسودہ تیار کرکے باادب پروپرائٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

ہیڈ کلرک اور منیجر دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ پروپرائیٹر صاحب ہمہ تن توجہ بنکر اس کو پڑھنے لگے۔ ادھر میں اطمینان سے نازو کی ناز بھری ہوئی نگاہوں کا جواب دینے لگا۔ میری نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ پاکر اُس نے معشوقیت برتنی شروع کی۔ میں اس کا کب روادار ہو سکتا تھا۔ اُٹھالئے تھے ناز جتنے اُٹھانے تھے بجمہ کے۔ قصہ مختصر وہ مسودہ بالاتفاق پاس کیا گیا۔ دوسرے روز سے وہی ہم تھے اور وہی ہمارا جانکاہ کام۔ اتنا ضرور ہوا کہ میں نے پروپرائیٹر صاحب کی نظروں میں ایک وقعت ضرور حاصل کرلی تھی۔ ہاں یہ منیجر صاحب اور میرے اسباب کی جنگ تھی جس میں فتحمند ہوا۔ اگر ایک ماہ میں یہاں اور رہجاتا تو مجھے پروپرائیٹر صاحب کا پرائیوٹ سکریٹری بننے کا فخر حاصل ہو جاتا۔ لیکن ناکامی نازو کی شکل میں منتقل ہو کر مجھے پامال کر رہی تھی، اور کرکے رہی۔

میں دو دفعہ دفتر اور جا چکا تھا اور حق المحنت کے طور پر بیس روپیہ

مجھے مِل بھی چکے تھے۔ ہیڈ کلرک اور منیجر صاحب۔ پروپرائیٹر صاحب کی نگاہ سے گر چکے تھے۔ اور میں اپنے اسباب کی مدد سے بلندی کی جانب بڑھتا چلا جارہا تھا۔ لیکن اِس ایک لغزش نے جس کو صوفی منش نوجوان محبّت کہتے ہیں مجھے پھر پست کر دیا۔ اگر محبت کوئی شئے ہے تو بہت ہی ذلیل شئے ہے۔ یہ کمبخت انسان کو کبھی پنپنے نہیں دیتی۔ اِس کے قانون میں گنجائش نہیں کہ انسان بیک وقت کامیاب زندگی کا مالک بھی بنا رہے اور محبت بھی کرتا رہے۔

نازو کی ایک ذرا سی غلطی نے میری اُس وقت کی قانع زندگی کو منتشر کر دیا۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں خلافِ معمول چھ بجے دفتر میں طلب کیا گیا۔ میں اپنی عادت کے مطابق مطمئن دل اور پُرسکون بشرے سے کمرے میں داخل ہوا لیکن وہاں کے سین نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے نازو کے والد کے ہاتھ میں ایک موٹا سا بید تھا۔ اُن کی آنکھیں غصہ سے باہر نکلی ہوئی تھیں چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔ اور نازو ایک پر بُریدہ قمری کی طرح اُن کے پیروں میں پڑی ہوئی زار و قطار رو رہی تھی یہ نظارہ مجھے آمادۂ ترحم کرنے کے عوض خائف کرنے لگا۔ میں خدا جانے کس خیال سے متوحش سا ہو گیا۔

کمرے میں اُس وقت بجز باپ بیٹی کے اور کوئی نہ تھا۔ میز پر پھیلے ہوئے کاغذوں کے اُوپر ایک طویل عبارت کا خط پڑا ہوا تھا۔ جس پر پروپرائیٹر صاحب کی نظریں پڑتی تھیں اور وہاں سے اکتسابِ غیظ کرکے نازو پر ابل پڑتی تھیں۔ میرے آتے ہی اُنھوں نے غیر معمولی گرجدار آواز میں چند کلمات

نفرت ادا کئے جن کو وفورِ غصّہ میں اس قدر جلد جلد کہا گیا کہ میں ٹھیک طور پر
اُن کو نہ سمجھ سکا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے میز پر رکھے ہوئے خط کو براہِ راست
میرے منہ پر کھینچ مارا۔ اور کف اُگلتے ہوئے بولے "یہی تمہاری تعلیم ہے؟
جس ہنڈیا میں کھاتے ہو اُسی میں سُوراخ کرتے ہو؟" "سوراخ؟ میں نے
آپ کے کارخانہ میں آکر صرف لکڑیوں میں سُوراخ کیا ہے اور کسی ......"
میں نے خط کو زمین پر سے اُٹھاتے ہوئے بغیر اُن کا مفہوم سمجھے ہوئے کہا۔
"بدزبان۔ تم یوں شریفوں کی لڑکیوں کو بگاڑا کرتے ہو۔ ایں! یہی یہی
تم۔ تم ———" اور وہ غصّہ سے کپکپانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ معاملہ کچھ
دگرگوں ہے جس میں لڑکیوں کو بگاڑنے والا قصّہ بھی شامل ہے جس کی افسوس
مجھے اب تک سعادت حاصل ہی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ فوراً ہی خط پڑھنا
شروع کر دیا۔ آہ زاہد! اب تم کو کیا لکھوں۔ اِس دیوانی لڑکی نے (نازو نے)
مجھے ایک طویل محبت نامہ لکھا تھا جس میں پہلے تو اپنی نسوانی کاذبِ حیا کی
گرفت کے ماتحت، جھجکتے جھجکتے میری سرد مہری کی شکایت کی تھی اس کے
بعد آگے جا کر جذبات کی رو میں ایسی بھی کہ خدا کی پناہ۔ ایک کوہ آتش فشاں
تھا کہ پھٹ پڑا۔ ایک سیلاب تھا کہ اُلٹ پڑا، مجھے خوب بُرا بھلا کہنے کے بعد
اُس نے نہایت حلاوت سے محبت کی دعوت دی تھی، اور آخر میں مشورہ
فراری! خط مجھ تک پہنچانے سے قبل غدار حامل نے نازو کے باپ کو دیدیا
تھا جس کا نتیجہ اس وقت پیش نگاہ تھا۔
خط کو غور سے پڑھنے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ نازو خود مجھے اپنی

محبت میں پھانس رہی تھی نا کہ میں نے فاسد اقدام کیا تھا، ہر شورہ اُس کی جانب سے تھا۔ ہر تجویز اُس کی پیش کردہ تھی حتیٰ کہ محبت بھی اسی کی پیش کردہ تھی! لیکن سر پھرے والدین اپنی جھوٹی حمیت کی حفاظت کرنے کے لئے اس موقع پر مرد ہی کو مطعون کیا کرتے ہیں۔ عجیب لطف تھا، جب محترم پروپرائیٹر صاحب نے اپنی قرۃ العین کو آزادی بخشدی تھی تو اُس کے معاشقہ پر استبداد قایم رکھنا کیوں جائز سمجھتے تھے؟ یہ تو وہی مثل ہوئی۔ ع

"خوان یغما چیدہ اند و منع سائل کردہ آمد"

ابھی تو اُن کو بہت سے سائلین ——— ہوس کار سائلین سے سابقہ پڑنیوالا تھا۔ میں تو پھر بھی بیگناہ تھا!

اگر میں اپنے مقدمہ کی ذرا وکالت کرتا تو با سانی تمام الزامات سے اپنے کو بری ثابت کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد نازو کی پوزیشن جس قدر نازک اور قرین تباہی ہو جاتی اُس کا اندازہ تم خود لگالو۔ چنانچہ میں نے تمام جرم اُلفت کو اپنے سر لینے کا تہیہ کر لیا۔ اور کذب کی بابرکت قوت کے ذریعہ نازو کی شخصیت اور اُس کے نسوانی وقار کی اِن الفاظ سے حفاظت کی:۔

"بیشک مجھ سے غلطی ہوئی۔ اس غلطی پر آپ جس قدر برافروختہ ہوں کم ہے۔ میں کم بخت آوارہ صحبتوں میں بیٹھکر اپنا چال چلن تو نہیں، لیکن عادتیں بہت کچھ بگاڑ چکا ہوں۔ میرے حریص دل نے آپ کی بیگناہ صاحبزادی پر ڈورے ڈالنے کی خود جراءت کی تھی۔ اِس میں اُن کا کوئی قصور نہیں ہے، آپ مجھ سے ناراض ہوں یا خوش: نکالیں یا رکھیں؛

پہلے میں نے ہی نازو کو خط لکھا تھا۔ قرار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بس ایک لفظ نہیں ——— تو ——— تو ——— تم ———

بہت۔ ذ——— ذ——— بدمعاش ہو۔ نکل جاؤ میرے کارخانہ سے۔

اسی وقت چلدو" نازو کے والد نے میرے الفاظ سے غصّہ ہو کر کہا۔

"بہت اچھا۔ یہ چلا۔ لیکن گذارش ہے کہ اس غیظ انگیز واقعہ کے جسقدر تاریک اثرات آپ محسوس کرسکیں جس قدر اِس حرکت کو آپ رکیک وسفہیانہ سمجھ سکیں سمجھ لیجئے اوران سب کا بار میری گردن پر بڑے زور سے رکھدیجئے۔ لیکن نازو کے متعلق کوئی خیال ——— بُرا خیال قایم نہ کیجئے ———" یہ الفاظ کہتا ہوا میں چلدیا۔ دفعتاً چند غم آلودہ سسکیوں کی آواز آئی اور شکستہ لہجہ میں نازو بولی "ابا——— کلیم بہت اچھے آدمی ہیں"

"چُپ اباکی بچی" پروپرائیٹر صاحب نے غصّہ میں اپنی بیٹی کو کمتر بیٹی بنا کر کہا۔

خدا کا شکر ہے زاہد کہ نازو کی زندگی تباہ نہ ہوئی۔ منیجر صاحب سے اُس کی شادی ہونے والی تھی چنانچہ اس واقعہ سے باخبر ہو کر وہ بھی مجھے نفریں کرنے لگے اور نازو کے متعلق کوئی بُرا خیال قایم نہ کرسکے۔ نازو اپنی خون تمنا کا اور ہم ایک دولتمند بیوی سے ہاتھ سے چلے جانیکا ماتم کرتے ہوئے رخصت ہوئے۔ یہ تھا ہمارا معصوم و مذموم دونوں قسم کا معاشقہ۔ کاش نازو نے مجھ سے تقدس مآب محبت کی ابتدا کی ہوتی۔ اس میں نہ تو اس کو اتصال کی اسقدر عجلت ہوتی نہ میرے صائب خیالات میں تذبذب کی کمزوری پیدا ہوتی۔

خیر ـــــ جناب ہم کارخانہ سے دھکے کھا کر نکلنے کے بعد بہت دنوں تک اِدھر اُدھر خاک چھانتے پھرے، زاہدا اگر انسان ہر سمت سے خالی الذہن ہو کر اپنے کو ایک ایسی سطح تک بلند کرنے میں کامیاب ہو جائے جہاں احساس پستی معدوم ہو جائے تو اُس کے اندر رکئی قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ میں پست سہی، نکما سہی، معطل سہی، لیکن ڈھیٹ اتنا ہو گیا ہوں کہ اب پا مالیوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتا ہوں۔ میں اَب رنج و غم سے اکتانے کے عوض گرداب بلا میں کود جایا کرتا ہوں۔ اور پھر حوادث و آلام کی چٹکیوں سے اِس طرح لطف لیتا ہوں جس طرح ایک ہاتھی کسی گڑھے میں چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے کاٹے جانے میں لطف لیتا ہے، لیکن اتنا بڑا جثہ پیدا کرنے کے لئے اور اپنے کو ایسا قدرسن بنانے کے لئے بڑی ریاضت کی ضرورت ہے!

ہماری ڈھٹائی کی ایک حکایت سنئے۔ پیسے جیب میں ختم ہو چکے تھے۔ شام کو صاف فاقہ نظر آرہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کیا کروں، ایک جوتے والے کی دوکان پر پہنچا۔ اور سلام کھینچ مارا۔ انھوں نے بغیر اپنے کام سے سر اُٹھائے کچھ گنگنا دیا۔

"نوکری چاہتا ہوں" میں نے اظہار مدعا کے طور پر کہا۔

"معاف کرو بابا۔ آگے جاؤ" اُنھوں نے مجھے فقیر سمجھ کر کہا۔

"معافی کیسی؟ میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں کچھ" میں نے ابرو پر بل ڈال کر کہا۔

"تو پھر؟" دکاندار نے پہلی بار اپنی چندھیائی آنکھوں سے مجھے

دیکھکر پوچھا۔

"میں تو نوکری چاہتا ہوں"

"نوکری کہاں" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں کیا دُنیا سے رحلت کرگئی" میں نے کہا۔

"نوکری دکری یہاں نہیں ہے"

"آپ کو معلوم ہے کہ میں ایم۔ اے پاس ہوں" میں نے سینہ تان کر کہا۔

"ہو گے" اس مختصر جواب سے اُنھوں نے میری تذلیل کرتے ہوئے کہا۔

"ہو گے کیا معنی؟ ہوں جناب۔ اِس وقت ہوں" میں نے شور مچا کر کہا۔

"شور نہ مچاؤ۔ بھاگ جاؤ"

"کیا لے کر؟" میں نے چند خوبصورت جوتوں کی طرف نظر جما کر کہا۔

"جاتے ہو یا نہیں۔ ہے شرط کہ گردن ناپی جائے تمہاری" اُنھوں نے بگڑ کر کہا۔

"اچھا چلدئیے۔ لیکن اس وقت سے ڈرئیے جب میں یہاں کا حکمراں ہوکر آؤنگا" یہاں سے باعزت رخصت ہوکر میں ایک مُرادآبادی برتن والے کی دُکان پر گیا۔

"تسلیمات بندہ نواز"

"آئیے" دکاندار نے مجھے گاہک سمجھکر بیٹھنے کی دعوت دی۔

"کوئی وہ چیز بھی ہوگی آپ کے ہاں۔ از قسم نوکری" میں نے رک کر حرف مطلب کہا۔

"جی؟" اُنھوں نے میرا مطلب نہ سمجھکر دریافت کیا۔

"ذرا پانی پیونگا" میں نے بات کا پہلو بدلکر کہا۔ اُنھوں نے لڑکے کو آواز دی جو پانی لے کر فوراً آگیا۔

"یہ جناب کا صاحبزادہ ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ ہی کا ہے" اُنھوں نے از راہ انکسار فرمایا۔

"میرا؟ میرا؟ خدا نہ کرے۔ مجھے زیادہ کانٹوں میں نہ گھسیٹئے اسی طرح میں ناکردہ گناہ مالک کارخانہ کی صاحبزادی سے کچھ تعلقات کے شکوک کی بنا پر نکالا گیا ہوں۔ اب آپ بھی مجھ پر خواہ مخواہ چھڑا ......"

"لفنگا کہیں کا۔ اُٹھ یہاں سے" دوکاندار نے بگڑ کر کہا۔

"یہ چلے" غرض ہم یہاں سے بھی رخصت ہوئے۔ اس کے بعد تم کو معلوم ہے میں نے کدھر کا رُخ کیا؟ ایک طوائف کے کوٹھے کا۔ بی جان مصروفِ استراحت تھیں۔ میں نے کہا "سنتی ہو؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور مجھ شکستہ حال کو اس طرح دیکھنے لگی گویا میں اُس کا مدت سے بچھڑا ہوا بھائی تھا۔

"آپ دیکھ کیا رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کہیئے آپ کا مقصد کیا ہے؟" اُنھوں نے دریافت کیا۔

"ہم پڑھے لکھے تو ہیں نہیں۔ نوکری چاہتے ہیں۔ ذرا مجھے نوکر رکھکر دیکھیئے۔ کیسے کیسے پارساؤں کو گانٹھ کر لاتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے۔ ملک میں چند ایسے شرمیلے نوجوانوں کی ایک جماعت موجود ہے جو علانیہ دادِ عیش دینے سے شرماتی ہے۔ اور ایک رہبر کی متلاشی ہے جو اُن کو اس دلچسپ منزل تک چپکے سے پہنچا دیا کرے، میں اس قسم کی خدمت نہایت عمدگی سے انجام دے سکتا ہوں۔ ہاں تو تنخواہ کیا دینگی آپ مجھے؟"

"بخشو مجھے۔ میں نے تم جیسے بہت سے لُقّے چلا دیئے ہیں۔ نیچے جاؤ۔ جلدی یہاں سے۔ ورنہ کلّو میاں سے ایسا پٹواؤں گی کہ صورت نہ پہچانی جائے گی۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" اِس میں خفا ہونے کی کیا بات تھی۔ یہ تو ایک معاملہ داری کی بات چیت تھی۔" میں نے کلّو میاں سے خوف کھا کر زینہ سے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔ اگر رنڈی کے مکان پر پٹ گئے تو گئی ہمیشہ کے لئے عزت۔ چنانچہ وہاں سے بھاگے۔

سرائے میں آکر میں نے سب سے پہلے تو اپنے والدین کو بُرا بھلا کہا اس کے بعد کالج کے تمام اساتذہ پر تبرّہ بھیجا۔ پھر حکومت کو کوسا۔ لعنت ہے اِس تباہ کن نصاب پر۔ عجیب اندھیر ہے۔ آج ہندوستان میں ہر احمق قوم کو اپنی اپنی درسگاہ کھولنے کی تو سوجھتی ہے جس میں وہی یونیورسٹیوں کے کلرک گر کورس کے علاوہ اور کوئی معقول تعلیم نہیں ہوتی۔ نہیں آتا

خیال تو کسی کو صنعت گاہ کھولنے کا نہیں آتا۔ اجتماعی طور پر ہندوستان میں ابھی ایک بھی مہتمم بالشان دار الحرفت نظر نہیں آتا۔ جہاں بدقسمت نوجوانانِ ہند کچھ سیکھ کر روٹی کما سکیں۔ اگر ہیں تو وہ بھی لوگوں نے فرقہ وارانہ چند چھوٹی چھوٹی حرفت گاہیں کھول رکھی ہیں۔ جن کا مقصد ملک کے دفعیہ بیکاری نہیں ہے بلکہ اپنی آمدنی و تجارت ہے۔ حکومت کو کیا غرض کہ وہ از خود یہ وبال اپنے سر مول لے۔ وہ جب دیکھتی ہے کہ یہ قوم غلامی ہی میں خوش ہے۔ صناع و دستکار نہیں بننا چاہتی۔ اگر لے دیکر مصنوعاتِ ملکی اور اس کے چند مجہول کارخانوں کا وجود ہے تو یو۔ پی میں ہے۔ جو غریب ہند کے ۳۳ کروڑ افراد کو صناع بنانے کے لئے بالکل غیر کافی ہیں۔ میں نے اپنی عمر کے قیمتی سال نکمی یونیورسٹی کی غیر سود مند سند لینے میں برباد کئے اگر ملک میں کوئی دار الحرفت ہوتا اور یہ گرانقدر عرصۂ عمر میں اس میں صرف کرتا تو آج یوں گلی کوچوں میں تلاش معاش مارا مارا نہ پھرتا۔

مسٹر بروے جو ہندوستانی مصنوعات کا یورپ میں سب سے پہلا تاجر ہے۔ اپنے عجیب و غریب کارناموں کو بڑے مزے سے بیان کرتا ہے۔ وہ بھی بدقسمتی سے گریجویٹ ہے اس نے اپنی زندگی کی ابتداء پھیری والے سے کی تھی۔ اس کے بعد بمبئی میں کسی دوکان پر ۱۰-۱۵ روپیہ ماہوار کا ملازم ہو گیا تھا۔ اور بڑھتے بڑھتے اب اپنے موجودہ مرتبہ تک جا پہنچا ہے۔ یورپ مشینوں کی ساحرانہ کرشمہ سازیوں سے اِسقدر

تنگ آگیا ہے، کہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کو وہ دستِ قدرت کا پیدا کردہ تحفہ سمجھتا ہے۔ مسٹر بروسے کہتا ہے میں نے چونڈری کے دوپٹہ اِنگلینڈ میں اس قدر فروخت کئے کہ ہندوستان اُن کی فراہمی میں عاجز آگیا تھا۔ کہتا تھا کہ ایک دن ایک بہت معروف ایکٹرس میری دوکان پر آئی جس کو بہت سی اشیاء میں نے تحفتاً پیش کیں اور دو چار چونڈری کے دوپٹہ بھی دیئے جن کو اُس نے پسند تو بہت کیا لیکن اُن کا مصرف نہ سمجھ سکی۔ میں نے (بروسے نے) اس سے درخواست کی ان کو وہ کسی تماشے میں ایکبار ضرور اِستعمال کرے۔ چنانچہ ایکٹریس نے دوران تماشے میں سوتے وقت اس کو اوڑھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سوتے وقت چونڈری کا دوپٹہ اُوڑھنا اِنگلینڈ میں فیشن ہوگیا۔ سارا لندن میری دوکان پر الٹ پڑا۔ اسی طرح ایک بار ایک کارخانہ دار نے مرادآبادی اُگالدان میرے پاس اِنگلینڈ روانہ کر دیئے کہ میں اُن کو بھی یورپ میں فروخت کر دوں۔ انگلینڈ والے پان تو کھاتے نہیں ہیں سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُن کا کیا کروں۔ آخر ایک تدبیر سمجھ میں آئی۔ ان کو ہندوستانی گلدان کے نام سے فروخت کیا اور اور اِس قدر بکے کہ دکان میں ایک بھی نہ رہا۔ اور تو اور زاہد اس شخص نے ایک ستم ظریفی یہ بھی کی کہ متھرا کے پیڑوں کو ہندوستانی چاکلیٹ کر کے خوب بیچا۔ اِنسان میں کام کرنے کا ڈھنگ ہونا چاہیئے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اب میں چہار سمت سے مایوس ہو چکا تھا۔ آخر میں نے سوچا کہ میری

کیوں نہ جاؤ۔ لیکن ہمتِ مردانہ نے کہا کہ مرے تیری بلا۔ یہ بزدلوں کا شیوہ ہے چل اُٹھ کام کر۔ میں تیری مدد کرونگی۔ چنانچہ میں جوتے سینے کے اوزار اور پالش کی ڈبیاں لے کر ایک فوج کی چھاؤنی کے قریب جا بیٹھا۔ اَب میں کوئی کام کامیابی کی توقع اور مایوسی کے خوف کے ماتحت نہیں کیا کرتا تھا بلکہ اس لئے کرتا تھا کہ وہ مجھے کرنا تھا۔ کام کو ایک شغلہ (ایسا مشغلہ جس کا دوسرا نام فرض بھی ہو سکتا ہے) سمجھکر کرتا تھا۔ میں جوتوں میں جس عزم و ارادہ سے ٹانکے لگاتا تھا وہ میری قوت ارادی کی استواری کا بیّن ثبوت ہوا کرتے تھے۔ میرے ہر کام سے حوصلہ، استواری، عزم و ثبات ہویدا ہوتا تھا۔ کسی کام کو بیگار کے طور پر نہیں کرتا تھا۔ گورے اپنے جوتوں پر پالش کراتے تو اس خوبصورتی سے کرتا کہ گویا میں پیدا اسی لئے ہوا تھا۔ جوتے اس عمدگی سے سیتا کہ میرے لگائے ہوئے ٹانکے کبھی نکلنے کا نام نہ لیتے۔ میرے ارادوں کے اس مبارک ثبات نے آخر ناکامیوں کو ایسا ذلیل کیا کہ انھوں نے پھر مجھے اپنا منحوس چہرہ دکھانے کی جرأت نہیں کی۔

زاہد تم تعجب کروگے ایک ماہ کے بعد جو میں نے اپنی کمائی کا جائزہ لیا تو وہ ساٹھ روپیہ سے کچھ اُوپر تھی چھاؤنی کے تمام گورے مجھ سے بہت خوش تھے۔ اور خوب دل کھول کر اُجرت دیتے تھے۔ پھر میری انگریزی کی اعلیٰ قابلیت سے ایسے مرعوب سے تھے کہ اوقات فرصت میں بھی میرے پاس آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ میں نے دوسرے مہینے میں ستّو روپیے سے

کچھ زیادہ کمایا۔ اَب تو یوماً فیوماً میری آمدنی بڑھنے لگی۔

مجھ پر اُس وقت ایسا دَور تھا جس میں مجھے احساس شخصیت کچھ نہ رہا تھا۔ میں نے اپنی تعلیم کے زعمِ باطل کو، اپنے نسلی تفاخر کو سب بھلا دیا تھا۔ اِنسان ماں باپ کے جنے سے شریف و ذلیل نہیں ہوتا بلکہ اس عالم اَسباب میں آکر اس کو خود سب کچھ بننا پڑتا ہے۔ چند ہندوستانی طلبا دشریف صورت موچی کو تعجب سے دیکھتے تھے، اور مذاق بھی اُڑاتے تھے۔ مگر میں پرواہ نہیں کرتا۔ جانتا تھا کہ انشاء اللہ یہ وقت اُن پر بھی ایک روز آئے گا۔ پیشہ کوئی بذاتِ خود ذلیل نہیں ہوتا۔ یہ تو پیشہ والے لوگوں کی اپنی حرکات ہیں جو اُن کو بدنام کردیا کرتی ہیں۔ تم دیکھو گے کہ جس قدر رفیض رساں اور کام کے پیشے ہیں مثلاً بھنگی، بہشتی، نائی، دھوبی، موچی، کنجڑا، قصائی وغیرہ سب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو ان پیشوں کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔ پیشوں نے ان لوگوں کو ذلیل و بدمعاش نہیں بنا رکھا ہے، بلکہ اُن کی اپنی جاہلانہ حرکات نے اِن پیشوں کو رُسوا کردیا ہے۔

میں اُس وقت اس سطح تک پہنچ گیا تھا جہاں ماضی کے تمام اَلم انگیز اثرات مستقبل کی پُرفریب توقعات اور حال کے پُرصعوبت احساسات میرے لئے کچھ نہ رہے تھے۔ میں نے اپنی پچھلی زندگی کو ایک بوسیدہ وازکاررفتہ کتاب کی طرح گڑھے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اُس زمانے میں

شناساؤں، دوستوں اور عزیزوں کے خطرۂ طعن کی مطلق پرواہ نہیں کرتا تھا، مجھے اپنے باپ کی پوزیشن، اپنے تعلیمی وقار وغیرہ کا کچھ احساس نہ رہا تھا۔ زاہد ذرا سوچو۔ مر کر بھی تو انسان ایسا ہی ہو جاتا ہے، یعنی اُس کے تمام احساسات فنا ہو جاتے ہیں۔ میں بھی اسی قسم کا ایک مُردہ تھا۔ جو ہر اعتبار سے مرا ہوا تھا، لیکن کام کرنے کو زندہ تھا۔ ایک متحرک مُردہ تھا جو کام کرتا رہتا تھا۔ ایک چلتی ہوئی مشین تھی جو اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ خواہ اس سے جوتے ہی ہو خواہ اس کو سر پہ بٹھالو۔ لیکن یہ حالت زیادہ نہ رہی اس دورِ جدید کے بعد میرے اندر اس کسب نو کے اثرات پیدا ہونے لازمی تھے، ورنہ میں واقعی ایک آہنی مشین ہی بنا رہجاتا۔ مجھے اپنے پیشے میں کمال حاصل کرنا تھا۔ میرے اندر تفوق کی سرگرمی پیدا ہونے کی ضرورت تھی۔ اور مجھے اب ایک باقاعدہ مستقبل کا پروگرام بنا کر شاندار آئندہ کی توقعات باندھنی تھیں، اپنے اس دورِ جدید کے ابتدائی مدارج تک میں سب کچھ بھلا چکا تھا، چنانچہ اس "ہمہ فراموشی" کا انعام اب مجھے ملنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے احساسِ مستقبل ہونا شروع ہوا جس نے میرے سرگرم کار ارادوں کو کامران بنا دیا۔

دفاتر کے عملے کے لوگ میرے سامنے سے گزرتے تھے۔ جن کے بشروں سے اضمحلال، تکدر، تکان اور بیزاری کے آثار ہویدا ہوتے تھے،

ضربیں

جو ترقی کی بلند ترین شاہراہ کو دفتر ہی کی دُنیا تک محدود کر چکے تھے۔ میری دُنیا ـــــــ میری کارکردگی کی دُنیا اُن سے وسیع تر تھی، میں سب کچھ کرنے کے لئے آزاد تھا۔ اور وہ صرف ایک کام وہ بھی سو سو طرح کی پابندیوں کے ساتھ کرنے پر مُکلف تھے!۔

اوقاتِ فرصت میں میں نے جوتہ بنانا بھی سیکھ لیا تھا اور چھ ماہ کی شدید محنت سے اِس قدر ہوشیار کاریگر ہو گیا تھا کہ میرے بنائے ہوئے جوتے دیکھکر لوگ دَنگ رہ جاتے تھے۔ وہ جوتے نہیں تھے بلکہ میرے عزم وارادہ کے نمونے تھے۔ جن کو لوگ تعریف سے پیروں میں ڈالتے تھے۔ اور جن کو میں پیروں میں پامال ہوتے دیکھکر صرف اِس وجہ سے خوش ہوتا تھا کہ میں نے اِنسان پر پیرُوں کی جانب سے قبضہ کرنا شروع کیا تھا۔

اَب میں اپنی تمام کامرانی وکامیابی کی طویل داستان تم کو کہاں تک سناؤں۔ تین سال میں میں نے جوتے کے زور سے اِس قدر رَوٹی کمائی کہ خود ایک بہت بڑی فرم کا مالک بن گیا۔ اِس فرم کو قایم ہوئے آج دس سال ہو گئے۔

جس میں تقریباً دو سو آدمی کام کرتے ہیں اور جس کا واحد مالک بھی تمہارا مصیبتوں کے آغوش میں پیدا ہوا کلیم ہے خدا کے فضل سے

روپیہ بھی بہت ہے۔ اور اولاد بھی ہے۔

میں نے زاہدؔ یہ عہد کرلیا ہے کہ اپنے بچوں کو ہرگز ہرگز اسکول یا کالج میں داخل کرکے اُن کی عمر برباد نہ کرونگا۔

اگر کالج میں داخل کروایا تو نازو کے والد کا کارخانہ، جوتے والے کی دکان، اور طوائف کا کوٹھا اُن کا بھی منتظر رہے گا!!۔

نیرالدین کاتب

ہماری مطبوعات

زلزلے ۔ قدوس صہبائی بی۔ اے۔ (آنرز) افسانوں کا مجموعہ۔

ملکوں میں زلزلے آتے ہیں تو در و دیوار اور دشت کانپتے ہیں۔ لیکن جب دلوں اور دماغوں میں آتے ہیں۔ تو تمدن کی بنیادیں اور تہذیب کی سر بفلک عمارتیں کانپتی ہیں۔ ادیب کے ذہن رسا اور خیالات کی دنیا میں جب زلزلے آتے ہیں تو اُن کی لرزشیں صفحہ قرطاس پر مُرتسم ہو جاتی ہیں۔ اور نقش و نگار عالم کی لرزش کا سبب بن جاتی ہیں۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش

قیمت :۔ دو روپیہ بارہ آنہ

سیلاب :۔ احمد ندیم قاسمی (افسانوں کا مجموعہ)

قاسمی واقعہ کا انتخاب زندگی سے کرتے ہیں۔ دکھ درد سے کراہتی زندگی، مسرت کے آغوش میں کھیلتی زندگی، محبت میں بیقرار اور غم روزگار سے گھری ہوئی زندگی، جس میں لوگ چوٹ کھاتے ہیں، چوٹ دیتے ہیں، روتے بسورتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ کامیاب ہوتے ہیں۔ ناکام رہتے ہیں فرشتے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیطان بن جاتے ہیں۔ لغزش کھا کر گرتے ہیں۔ سنبھل جاتے ہیں۔ قاسمی نے ایسے ہی خاکوں میں رنگ بھرا ہے۔

کتابت طباعت اعلیٰ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت :۔ تین روپیہ آٹھ آنہ

انگڑائیاں منتخبہ احمد ندیم قاسمی۔ (افسانوں کا مجموعہ)

یہ مجموعہ ہندوستان کے پندرہ مشہور افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ اِن افسانوں کو منتخب کرنے والا خود بھی افسانہ نگاروں کی اولین جماعت میں شامل ہے۔ اِسلئے اس کی نگاہِ انتخاب کی صحت مسلّم ہے۔

کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد رنگین گرد پوش۔ قیمت :۔ (۳) روپے ۴ر

زندگی کی ٹھوکریں:۔ رئیس احمد جعفری (افسانوں کا مجموعہ)

اِن افسانوں کا ہر افسانہ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ زندگی جو ہم سب گزار رہے ہیں۔ جو ہم سب کے سامنے گزر رہی ہے۔ جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ جس کا نغمہ اور نوحہ ہمارے کان زور سے سُنتے رہتے ہیں۔ جس کی ناکامی اور حرمان نصیبی پھر جس کی کامیابی اور کامرانی ہمارے دماغ میں بسی رہتی ہے۔ جسے ہم کبھی یکسر خندہٗ و قہقہہ اور کبھی آہ و بکا کی صورت میں دیکھتے ہیں۔

کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت۔ تین (۳) روپیہ

تقدیریں:۔ از منظور بخاری۔ بی۔ اے۔

اِنسانی زندگی میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اور دنیا میں انسان نے کیسی کیسی مشکلات پر قابو پاکر ترقی کی، بڑے بڑے انسانوں کی ایجادیں اور تصنیفیں کس طرح ظہور پذیر ہو سکیں۔ وہ کیا حالات ہیں جس سے کسی انسان میں بڑا بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیوں اور کس طرح کوئی انسان یک بہ یک ہماری نگاہوں میں ممتاز شخصیت بن جاتا ہے۔ ایسے